جمال و حسنِ قرآں نورِ جانِ ہر مسلماں ہے
قمر ہے چاند اوروں کا ہمارا چاند قرآں ہے

الفرقان

«جماعت اسلامی نمبر»

مئی - جون 1955ء

قیمت جماعت اسلامی نمبر	ایڈیٹر	سالانہ چندہ پیشگی
ایک روپیہ	ابو العطاء جالندھری (ربوہ - پاکستان)	پانچ روپے

"الاخوان المسلمون" کی تحریک

پر

وزیر اعظم مصر کا تحریری بیان

جناب جمال عبد الناصر وزیر اعظم مصر نے ان اقدامات کی وضاحت کرتے ہوئے جو ان کی حکومت نے جمعیۃ الاخوان کے خلاف کئے ہیں تحریر کیا ہے :-

"والحق اننا لم نقم بهذا الاجراء الا بعد ان انحرفت جماعة الاخوان الارهابية المنحلة- عن طريق الاسلام الصحيح وامتناعها عن تقديم الاسلحة ووسائل النسف والتدمير التي يخفيها اعضاء الجهاز السري لاستعمالها في الاغتيال والتخريب التي اتخذته وسيلة لها لتنفيذ مآربها ومطامعها في اعتلاء الحكم بالقوة بعد الاجهاز على اعضاء مجلس قيادة الثورة والمخلصين من ابناء الوطن - وقد اعترف اعضاء هذه الجماعة اعترافاً صريحاً بكل هذه الخطط عند محاكمتهم امام محاكم الشعب - ولا شك ان الامم الاسلامية في أشد الحاجة الى الاستقرار والبناء بعد ان تخلص معظمها من كابوس الاستعمار"

"یہ حقیقت ہے کہ ہم نے یہ اقدام صرف اس وقت کیا جبکہ الاخوان کی دہشت پسند جماعت نے جسے اب خلافِ قانون قرار دے دیا گیا ہے صحیح اسلام کے طریق سے سراسر انحراف اختیار کر لیا - اور ان اسلحہ اور آلاتِ تخریب و بربادی کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا جو ان کی خفیہ پارٹی نے چھپا رکھے تھے - تا وہ انہیں خونریزی اور اچانک قتل و تخریب میں استعمال کر سکیں - اس جمعیت نے اس طریق کو حکومت پر جبراً قبضہ کرنے کے لئے ذریعہ بنا رکھا تھا - وہ چاہتے تھے کہ قیادۃ الثورہ کی مجلس یعنی موجودہ حکومت کے ارکان نیز مخلص فرزندانِ مصر کو ختم کرنے کے بعد وہ اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے برسرِ حکومت آجائیں - خود اس جمعیت کے اراکین نے محاکم الشعب میں دورانِ مقدمات تمام امور کا واضح اعتراف کیا ہے - اور یہ ظاہر ہے کہ اُمم اسلامیہ جن کا بیشتر حصہ ابھی ابھی استعمار کے پنجہ سے رہا ہوا ہے اس وقت اس بات کی سخت محتاج ہیں کہ انہیں استحکام حاصل ہو اور وہ تعمیری کام کر سکیں "

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

مجلس انصار اللہ مرکزیہ کا ترجمان

الفرقان

ایڈیٹر
ابو العطاء جالندھری
نائب ایڈیٹرز
قاضی محمد نذیر لائلپوری مولوی فاضل
مسعود احمد دہلوی بی-اے

چندہ سالانہ
پاکستان و بھارت کیلئے
پانچ روپے
دیگر ممالک سے پندرہ شلنگ

جماعت اسلامی نمبر

جلد ۵	مئی، جون ۱۹۵۵ء ـــــ رمضان، شوال ۱۳۷۴ھ	نمبر ۵-۶

مقالات

(طابع و ناشر ابو العطاء جالندھری نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ میں چھپوا کر دفتر رسالہ الفرقان ربوہ ضلع جھنگ سے شائع کیا)

ضروری گزارشات

حضرات آپ کے سامنے الفرقان کا "جماعت اسلامی نمبر" پیش ہے، اس سلسلہ میں چند گذارشات عرض ہیں :۔

(۱) جناب مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی تحریک اور جماعت اسلامی کے بارے میں یہ نمبر جامع اور مستند معلومات پر مشتمل ہے۔ ایک بنیادی اور تفصیلی مقالہ ہمارے عزیز دوست مولانا دوست محمد صاحب فاضل کا ہے۔ پھر تحقیقاتی عدالت میں پاکستان کے بہترین ججوں نے جماعت اسلامی کے خیالات و طریق کار کے متعلق جو بیانات جمع کر دیئے ہیں وہ بھی نہایت مفید اور مستند مجموعہ ہے۔ جناب شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے کے مضمون میں جماعت اسلامی کی صحیح تاریخ اور اس جماعت کے امیر کے سوانح پر سیر حاصل معلومات ہیں۔ جناب مسعود احمد صاحب دہلوی بی۔ اے اور جناب بشیر احمد صاحب فوق بی۔ اے کے مختصر مقالات میں جماعت اسلامی کے مقاصد اور سیاسی پالیسی پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ الغرض یہ کہنا بجا ہے کہ اس نمبر کے جملہ مضامین اپنی افادیت میں بہتر اور شامل ہیں۔

یاد رہے کہ اس نمبر کی اشاعت سے کسی کی دلآزاری یا کسی کے خلاف اشتعال انگیزی اور کسی کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنا ہرگز مقصود نہیں بلکہ نرم پیرایہ میں محض حقائق کا اظہار مدنظر ہے۔ اسلئے آپ کو اس نمبر میں اسلامی جماعت کے اخبارات المنیر، تسنیم اور کوثر وغیرہ کا تابڑ توڑ القاب اور ان کے طنزیہ فقرات نہیں ملیں گے۔ نہ ہی کوئی اشتعال انگیز عبارت ملیگی اور نہ ہی کوئی سب و شتم اور دلآزار بیانات نظر آئینگی۔ ہمیں مسرت ہے کہ ہم سنجیدہ الفاظ میں ٹھوس حقائق پیش کر رہے ہیں۔

(۲) جماعت اسلامی نے "الاخوان المسلمون" کے نام پر مصر کی مسلمان حکومت کے بدنام کرنے کیلئے جو مہم جاری کر رکھی ہے وہ بین الاقوامی سیاست کے لحاظ سے بھی مناسب نظر نہیں آتی۔ بلاشبہ ہر مظلوم کی حمایت ضروری ہے مگر اس بارے میں ناجائز حمیت بجائے خود ظلم ہے۔ وزیر اعظم مصر جناب جمال عبدالناصر کا تازہ تحریری بیان اس بارے میں نہایت واضح ہے جو اس معاملہ کے متعلق پر شائع ہو رہا ہے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے حقائق پر غور کرنے کا عادی بننا چاہیئے۔

(۳) یہ موضوع خاص دلچسپی کا باعث ہے کہ جناب مودودی صاحب نے بہت سی باتوں میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام کی نقل کی کوشش کی ہے۔ دیوبند کے مفتی مولانا عزیز الرحمن صاحب نے اسی بناء پر "مرزائیوں کو جماعت اسلامی کے اسلاف" قرار دیا تھا[1]۔ اس سلسلہ میں آپ اس نمبر میں مکرم مولوی دوست محمد صاحب کے قیمتی مقالہ میں بہت سی مثالیں پائیں گے جن سے ظاہر ہے کہ مولانا مودودی صاحب بہت سی باتوں میں احمدیت کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ البتہ سیاسی اقتدار کے حصول میں وہ کمیونزم کے مقلد ہیں۔

(۴) جماعت اسلامی بھارت میں بھی ہے اور پاکستان میں بھی۔ مگر دونوں کے اسلامی دستور الگ الگ ہیں۔ بھارت میں جو "قیادت کافرہ" برسر اقتدار ہے وہاں کی جماعت اسلامی اس سے پورا پورا تعاون کر رہی ہے، اسکے احکام کی تعمیل کر رہی ہے اور اس ملک میں حکومت کے خلاف کوئی نفرت و حقارت پیدا نہیں کرتی۔ اسکے بالمقابل پاکستان میں جو حکومت موجود ہے وہ مولانا مودودی کے الفاظ میں قیادت فاسقہ ہے جس کا تبدیل کرنا فرض ہے۔ آپ اس شمارہ کے ایک شذرہ میں جماعت اسلامی کے اس متضاد موقف کے بارے میں مختصر بیان ملاحظہ فرمائیں گے۔ (۵) آخری صفحہ پر تین تصاویر شائع ہو رہی ہیں۔ ایک میں ہمارے امام حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ کراچی سے دمشق کے لئے طیارہ پر سوار ہو رہے ہیں۔ دوسری تصویر جناب چودھری محمد ظفر اللہ خان صاحب سے گفتگو فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپکو جلد صحت کاملہ کے ساتھ واپس لائے۔ آمین۔ تیسری تصویر حضرت مولوی نذیر احمد صاحب علی رحمہ اللہ کی ہے آپ نے اپنے وطن سے دور اپنے اہل و عیال سے جدا سیرالیون مغربی افریقہ میں تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا کرتے ہوئے ۱۹ مئی ۱۹۵۵ء کو وفات پائی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

[1] ملاحظہ ہو دارالعلوم دیوبند کا مطبوعہ فتویٰ بعنوان "کشف حقیقت"۔

مولانا مودودی شرعاً نئی جماعت بنانے کے مجاز نہیں

قرآن مجید و احادیثِ نبویہ کی رو سے فرقہ بندی سخت جرم ہے

کیا مولانا مودودی نبی یا مسیح موعود ہونے کے مدعی ہیں ؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ (سورۃ الحج) کہ اللہ تعالیٰ کو پانے کے لئے پورا جہاد کرو۔ اسی نے تم کو اے مسلمانو! برگزیدہ کیا ہے اور دین کے بارے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رہنے دی اپنے باپ ابراہیمؑ کے طریق کو اختیار کرو اس نے پہلے بھی تمہارا نام مسلمان رکھا اور اس دور میں بھی تمہیں مسلمان ٹھہرایا تا یہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم باقی لوگوں پر گواہ ہو پس حقیقی طور پر نمازیں قائم کرو۔ زکاۃ دو اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ مضبوط تعلق قائم کرو وہی تمہارا آقا ہے کیسا اچھا آقا اور کیسا اچھا مددگار ہے۔"

اس آیت کریمہ میں اُمتِ مسلمہ یا اسلامی جماعت کے بنانے کی غرض اور بنانے کا طریق خود خدائے ذوالجلال نے بیان فرما دیا ہے۔ جملہ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ میں صاف بتا دیا گیا ہے کہ اسلامی جماعت قائم کرنا خدا تعالیٰ کا کام ہے اور وہ نبی کے ذریعہ سے قائم ہوتی ہے۔ اسکے قائم کرنے کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ نبی اس جماعت کے لئے نمونہ ہو اور اس پر گواہ ہو اور وہ جماعت دوسرے سارے لوگوں کے لئے نمونہ ہو اور سب پر گواہ ہو۔

یہ وہ اہم نصب العین ہے جس کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اسلامی جماعت قائم کی جاتی ہے۔ لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ کو دوسری جگہ بہ پیرایۂ دیگر اس طرح بیان کیا ہے۔ فرماتا ہے قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (سورۃ یوسف ع ۱۲) اے نبی! تو اعلان کر دے کہ میرا کام اور میرا طریق کار یہ ہے کہ میں اور میرے ماننے والے علیٰ وجہ البصیرت دعوۃ الی اللہ کرتے ہیں خدا پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔" پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نبی کے ذریعہ سے جو اُمتِ مسلمہ قائم کرتا ہے وہ دعوت الی اللہ کے لئے قائم ہوتی ہے اور یہی اس کا اصل کام اور نصب العین ہوتا ہے۔

قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُمتِ مسلمہ میں تفرقہ پیدا کرنا بدترین جرم ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا (آل عمران) اے مسلمانو! تم ان پہلے غلط کار لوگوں کی طرح نہ بن جانا جو مختلف فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (الانعام ع ۲۰) کہ جو لوگ دین میں تفرقہ

پیدا کرکے فرقوں میں منقسم ہوجائیں تو پیغمبر! تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہ انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کریگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرتا ہے وہ سخت سزا کا مستوجب ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ یہود کے بہتر فرقے ہوگئے تھے۔ میری اُمت کے تہتر فرقے ہوں گے، وہ سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک فرقہ کے جو میرے اور میرے صحابہ کے نقش قدم پر چلنے والا ہوگا۔ الغرض قرآن مجید اور احادیث میں اس شخص کی بہت مذمت کی گئی ہے جو اُمت میں تفرقہ کی بنیاد رکھتا ہے اور ایک نیا فرقہ بناتا ہے اسلئے یہ کہنا بجا ہے کہ اسلام میں فرقہ بندی پیدا کرنا حرام اور ناجائز ہے۔

قرآن مجید اور احادیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ نئی اُمت مسلمہ نبی کے ذریعہ سے بنتی ہے اور اُمت محمدیہ پر دو دور آنے مقدر تھے۔ ایک اولین کی جماعت اور دوسری آخرین کی جماعت۔ اللہ تعالیٰ نے ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ (الواقعہ) کہکر ان دو جماعتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ سورۂ جمعہ کے پہلے رکوع میں بھی یہی بیان ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے سیکون فی اٰخر امتی رجال لھم اجر مثل اولھم یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویقاتلون اھل الفتن (مشکوٰۃ المصابیح) کہ اس اُمت کے آخری حصہ میں ایسے لوگ ہوں گے جنہیں پہلے صحابہ کی طرح اجر و ثواب ملیگا۔ وہ امر بالمعروف کرینگے اور نہی عن المنکر ان کا شعار ہوگا تمام اہل فتن کا مقابلہ کرینگے۔ دوسری حدیث میں فرمایا ہے مثل اُمتی مثل المطر لا یدری اولہ خیر ام اٰخرہ (مشکوٰۃ المصابیح) کہ میری اُمت کی مثال اس بارش کی ہے جس کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ اس کا پہلا حصہ زیادہ مفید ہے یا آخری حصہ۔ پھر ایک اور حدیث میں ہے کیف تھلک اُمۃ انا فی اولھا والمسیح فی اٰخرھا (مشکوٰۃ المصابیح) کہ وہ اُمت کیسے ہلاک ہوسکتی ہے جس کے اول میں میں ہوں اور جس کے آخر میں مسیح موعود ہوں گے۔ ان آیات و احادیث سے عیاں ہے کہ اُمت مسلمہ کو نئی جماعت میں تبدیل کرنے کا واقعہ آخری زمانہ میں ہوگا۔ مگر یہ کام ایک عظیم الشان موعود نبی مسیح موعود کے ذریعہ سے ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظلیت میں یہ کام کریگا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں اور دوسرے لوگوں کی حالت تقاضا کر رہی تھی کہ ان کی اصلاح کے لئے ایک پیغمبرانہ تحریک اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری ہو۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں :- "جس کے (یعنی مسلم قوم کے) ننانوے فیصدی افراد اسلام سے جاہل اور ننانوے فیصدی منحرف اور ننانوے فیصدی انحراف پر مصر ہیں یعنی وہ خود اسلام کے طریقہ پر چلنا نہیں چاہتے اور نہ اس منتشار کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔" (ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۴۴ء) جناب مودودی صاحب کی جماعت کے مشہور مصنف مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری لکھتے ہیں :-

"واقعہ یہ ہے کہ معترضین یا مخالفین نے تحریک تصوف اور تحریک اقامت دین کے فرق کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ تحریک اقامت دین ایک پیغمبرانہ تحریک ہے اور تحریک تصوف مصلحانہ۔ یا یوں سمجھئے کہ تحریک اقامت دین ایک عام انقلابی تحریک ہے اور تحریک تصوف اندرونی اصلاحی۔ اور ان دونوں تحریکوں کا وقت اور زمانہ جدا جدا ہوتا ہے۔ جب دین کا غلبہ اور اقتدار قائم ہو اور دولت و خوشحالی کی کثرت کے باعث مسلمانوں میں تعلیمی اور فکری آخرت کے بجائے نفس پرستی اور دنیا داری پھیلنے لگے اور اس حالت کی اصلاح مقصود ہو تو اس وقت کیلئے تصوف کی تحریک مفید ہوسکتی ہے ... لیکن جب کفر و الحاد کا اقتدار قائم ہو اور اقامت دین کی تحریک اٹھائی جائے تو اس حالت میں انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کا طریقۂ کار مفید ہوسکتا ہے ... اس تحریک کے رضاکاروں کی تیاری کیلئے طریقۂ نبوت کے سوا اور کوئی طریقہ موزوں نہیں ہوسکتا۔" (رسالہ تحقیقی جائزہ صفحہ ۴۷-۴۹)

اب نہایت واضح اور معین سوال یہ ہے کہ جناب مودودی صاحب نے اس زمانہ میں نئے فرقہ اور نئی اسلامی جماعت کی بنیاد کس بنا پر رکھی ہے؟ کیا وہ مدعی رسالت ہیں؟ کیا انہوں نے پیغمبرانہ تحریک نبی ہونیکی بنا

اشتراکی انقلاب کا طریقِ کار

اور

جماعتِ اسلامی

(از قلم جناب مسعود احمد خان صاحب دہلوی۔ بی اے)

جماعتِ اسلامی حصولِ اقتدار کے جن طریقوں کو اختیار کرنا جائز سمجھتی ہے ان کو اسلام سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے بلکہ وہ ہو بہو کمیونسٹ طریقوں کا چربہ معلوم ہوتے ہیں۔ امیر جماعت اسلامی جناب سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کا سب سے بڑا "کارنامہ" یہی ہے کہ انھوں نے حصولِ اقتدار کے کمیونسٹ طریقوں کو ذرا ترمیم کر کے بزعم خود انہیں اسلام کا نام دیدیا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو ظاہر تو اسلام کا علمبردار کہتے ہیں لیکن حصولِ اقتدار کے انہیں طریقوں کی تلقین کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو کمیونزم کا طرۂ امتیاز ہیں۔

مثال کے طور پر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کمیونزم کے ماننے والے معاشی تفریق کے خلاف آواز اٹھانے یا اس کے لیے آئینی جدوجہد کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ غریبوں کو امراء کے خلاف اشتعال دلا کر انہیں بغاوت پر اکساتے ہیں اور تشدد کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ کرنے کو اپنی انقلابی جدوجہد کا نقطۂ آغاز تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ روس کا مشہور ڈکٹیٹر مارشل سٹالن اپنے ایک مضمون ——— Anarchism & Socialism میں لکھتا ہے:-

"The Socialist dictatorship of the proletariat, the seizure of political power by the proletariat — this is what the socialist revolution must begin with."

(Stalin's Kampf. Page 45)

یعنی پرولتاریہ کی سماجی آمریت اور سیاسی اقتدار پر بالجبر قبضہ ——— وہ اولین قدم ہے جس سے اشتراکی انقلاب کا آغاز ہونا چاہیئے۔

ظاہر ہے اس میں کسی قسم کی آئینی جدوجہد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ صاف اور واضح الفاظ میں آغاز کار ہی بغاوت کے ذریعہ حکومت پر زبردستی قبضہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مودودی صاحب بھی اسلامی جہاد کو جنگی حیثیت اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں یکسر دفاعی قرار دی ہے، اپنی نوعیت کے اعتبار سے جارحانہ ثابت کرنے کے بعد بعینہٖ یہی تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ "صالح" بندوں کو خدا، رسول اور اسلام کے نام پر مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"خلقِ خدا کی اصلاح کے لیے اٹھو حکومت کے غلط اصول کو صحیح اصول سے بدلنے کی کوشش کرو۔ ناخدا ترس اور شریر لوگ مقیم

کے لوگوں سے قانون سازی اور فرمانروائی
کا اقتدار چھین لو۔" (خطبات ص۲۰۲)

کہا جا سکتا ہے کہ قانون سازی اور فرمانروائی کا اقتدار "شتر بے مہار" قسم کے لوگوں سے آئینی طریقوں پر بھی چھینا جا سکتا ہے اور یہ کہ کیا عجب ہے کہ مودودی صاحب کے ذہن میں بھی صرف آئینی جد و جہد ہی ہو لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ اس قسم کی خوش فہمی کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ اسی مضمون میں آگے چل کر یہ بھی بتاتے ہیں کہ "صالح" بندے یہ اقتدار کس طرح چھینیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

"اب تم روئے زمین پر خدا کے سب سے
زیادہ صالح بندے ہو لہذا آگے بڑھو،
لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل
کر دو اور خلافت کے اختیارات اپنے ہاتھ
میں لے لو۔" (خطبات ص۲۰۵)

اس سے ظاہر ہے کہ سٹالن جس طرح اشتراکی انقلاب کے لئے یہ ضروری خیال کرتا ہے کہ موقع ملتے ہی سیاسی اقتدار پر بالجبر قبضہ کر لیا جائے۔ اسی طرح مودودی صاحب کے نزدیک بھی نعوذ باللہ "اسلامی انقلاب" برپا کرنے کیلئے ناگزیر ہے کہ خواہ مخواہ جنگ کر کے "صاحبانِ اقتدار" سے قانون سازی اور فرمانروائی کا اقتدار چھین لیا جائے۔ اس بارے میں مودودی صاحب ملکی اور غیر ملکی یا قومی اور اجنبی کی تفریق بھی روا رکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ انکے اپنے نظریات کے مطابق اگر کوئی حکمران یا صاحبِ اقتدار طبقہ اسلام پر پوری طرح عامل نہیں ہے تو وہ بھی غیر ملکی حکمرانوں کی طرح فرمانروائی کا حق نہیں رکھتا اور اس قابل ہے کہ "خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے" لڑ کر اسے حکمرانی کے حق سے بے دخل کر دیں۔ چنانچہ مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"حقیقت یہ ہے کہ اسلام حکومت
کے معاملے میں "قومی" اور "اجنبی" کی کوئی
تمیز نہیں کرتا بلکہ "عدل" اور "ظلم" کو وجہ
امتیاز قرار دیتا ہے۔ اگر ایک ملک کی
حکومت خود اس کے اپنے باشندوں کے
ہاتھ میں ہو لیکن اس کے حکمران بدکار، ظالم،
نفس پرست اور ناخدا ترس ہوں تو اسلام
کی نگاہ میں وہ اسی قدر نفرت کے قابل
ہیں جس طرح ایک اجنبی حکومت کے ایسے ہی
بدکردار عمال ہو سکتے ہیں۔"
(الجہاد فی الاسلام ص۱۱۲)

آئیے اب اس سوال پر غور کریں کہ مارشل سٹالن اور جناب سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اپنی اپنی جگہ اشتراکی انقلاب اور نام نہاد اسلامی انقلاب کے لئے آغاز کار کے طور پر حکومت پر بالجبر قبضہ کو کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں اس بات کے قائل ہیں کہ کسی مسلک کی محض زبانی تلقین دنیا میں کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتی۔ زبانی وعظ و نصیحت اور پراپیگنڈا و تبلیغ کا انسانی ذہن پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو محض چند ایک اشخاص پر اور اس کی حیثیت بھی بسا اوقات عارضی ہوتی ہے۔ اسی لئے ان دونوں کے نزدیک نہایت ضروری ہے کہ تلوار ہاتھ میں لیکر پہلے حکومت پر قبضہ جمایا جائے اس کے بعد لوگ خود بخود اس مسلک کو قبول کر لینگے۔ جس مسلک کو پھیلا کر انہیں بامِ ترقی پر پہنچانا مقصود ہو۔ چنانچہ سٹالن خود لینن کے حوالے سے لکھتا ہے :-

" First seize power,
Create favourable
Conditions for the
development of the

proletariat and then advance with seven-league strides to raise the cultural level of the working masses and form numerous cadres of leaders and administrators recruited from among the workers"

(Leninism Page 22-24)

یعنی پہلے اقتدار پر بالجبر قبضہ کرکے ایسے حالات پیدا کروکہ ہم پرولتاریہ کو تربیت دے کر انہیں ترقی کی راہ پر گامزن کیا جا سکے۔ اسکے بعد تم مزدور عوام کی سماجی اور ثقافتی حالت کو بہتر بنانے کے سلسلے میں برق رفتاری سے کام کرسکو گے اور مزدوروں ہی میں سے مختلف اہلیت کے لیڈر اور نظم ونسق چلانے والے افسر میسر آسکیں گے۔

خالصۃً بے دینی "اشتراکی انقلاب" کے نام پر سٹالن نے جو بات کہی تھی اور جسے ہم نے اوپر نقل کیا ہے مودودی صاحب بھی اس مخصوص انقلاب کی خاطر جو انکے مدّنظر ہے بعینہٖ یہی بات کہتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں بظاہر خالص دینی انقلاب کے نام پر کہتے ہیں اور ایسے دینی انقلاب کے نام پر کہتے ہیں جو فی الاصل سراسر صلح وآشتی اور امن وامان سے عبارت ہے وہ لکھتے ہیں:-

"اصلاحِ خلق کی کوئی سکیم بھی حکومت کے اختیارات پر قبضہ کئے بغیر نہیں چل سکتی؛ جو کوئی حقیقت میں خدا کی زمین سے فتنہ وفساد مٹانا چاہتا ہو اور واقعی یہ چاہتا ہو کہ خلقِ خدا کی اصلاح ہو تو اس کے لئے محض واعظ اور ناصح بن کر کام کرنا فضول ہے۔ اسے اٹھنا چاہیئے اور غلط اصولوں کی حکومت کا خاتمہ کرکے غلط کار لوگوں کے ہاتھ سے اقتدار چھین کر صحیح اصول اور صحیح طریقے کی حکومت قائم کرنی چاہیئے۔" (خطبات ص۲۰)

روس کے مشہور کمیونسٹ ڈکٹیٹر مارشل سٹالن آنجہانی اور امیر جماعتِ اسلامی جناب سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی تصانیف سے ہم نے جو حوالہ جات نمونۃً اوپر نقل کئے ہیں اگر انہیں ایک ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو دونوں طریقِ کار کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ترجمانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ان میں سے اوّل الذکر بالبداہت ایک لادینی تحریک کا قائد ہے جس کے نزدیک حصولِ اقتدار کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے فتنہ وفساد، ظلم وتشدّد اور حیلہ وفریب سے کام لینا ازحد ضروری ہے۔ برخلاف اس کے مؤخر الذکر صاحب کہتے تو لفظ بلفظ وہی ہیں جو اوّل الذکر نے کہا ہے لیکن ساتھ ہی اپنے آپ کو ایک ایسے دینی تحریک کا علمبردار ظاہر کرتے ہیں۔ اور دینوں میں سے بھی اس دین کا جس کا فتنہ وفساد، ظلم وتشدّد اور حیلہ وفریب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ حتّٰی کہ جو دین کے نام پر دفاع کے لئے بھی اس وقت تک تلوار ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دیتا کہ جب تک اس دین کے نام لیواؤں پر عرصۂ حیات تنگ کرکے انہیں ہجرت پر مجبور نہ کردیا جائے اور پھر جہاں وہ پناہ لیں وہاں بھی انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا جائے۔ ان حوالوں کو ایک ساتھ پڑھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے کہ کہاں تشدّد کے بل پر قائم ہونیوالی اشتراکی

ڈکٹیٹر شپ کا علمبردار اور کہاں اسلام جیسے صلح و آشتی کے مذہب کی طرف منسوب ہونیوالی ایک تحریک کا قائد! العجب! ثم العجب!! دونوں حصولِ اقتدار کی خواہش اور اس کے طریق کار کے لحاظ سے ایک ہی کشتی میں سوار نظر آتے ہیں دونوں کا ذہنی اعتبار سے باہم دگر ایک ہونا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ جناب سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی نے کمیونسٹ طریقوں کو اپنا کر انہیں اسلام کا نام دے دیا ہے۔ اور یہی وہ سب سے بڑا ظلم ہے جو انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے اسلام پر کیا ہے اور ایسا کرنے میں انہوں نے اس بات کی بھی پرواہ نہیں کی کہ اس طرح وہ خود مستشرقین میں اُن دشمنانِ اسلام کی تائید کر رہے ہیں کہ جنہوں نے اسلام کو ظلم و تشدد کا مذہب ثابت کرنے میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے ہیں +

بھارت اور پاکستان کی جماعت اسلامی میں فرق

قیادتِ کافرہ کی اطاعت فرض ہے اور قیادتِ فاسقہ سے بغاوت لازمی ہے

جماعتِ اسلامی کے عالم مولوی ابو محمد رام نگری (بھارت) دیوبندی مفتی کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"مفتی صاحب کو تکفیر سے خاص دلچسپی ہے اسلئے وہ ڈھونڈ کر ایسی صورت پیدا کر لیتے ہیں تقسیم ہند سے پہلے مولانا مودودی مجالس قانون ساز وغیرہ کے انتخابات میں حصہ لینے کو ناجائز کہا کرتے تھے اور اب پاکستان کے انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں۔ اس بنا پر مفتی صاحب نے جماعت اسلامی کی تکفیر کا یہ پہلو پیدا کیا ہے کہ مولانا مودودی نے آیت من لم یحکم بما انزل اللہ کے ماتحت خدا کے حکم کے خلاف عمل کرنیوالوں کو کافر ٹھہرایا ہے اسلئے پاکستان کے انتخابات میں حصہ لینے کے باعث وہ مع اپنی جماعت اور معاونین کے کافر ٹھہرتے ہیں ـــــ کفر سازی کا یہ اصول بالکل وہی ہے جس کے مطابق علمائے دیوبند کے مخالف حضرات انہیں کافر ٹھہرایا کرتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی ہند کا مولانا مودودی سے اب کوئی عملی تعلق نہیں باقی رہا۔"

مولوی رام نگری صاحب نے اس جگہ بحوالہ ترجمان القرآن مولانا مودودی صاحب کے الفاظ میں ہی ان کا جواب درج کیا ہے۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں :- "اگر ہم انتخابات میں عملی حصہ نہ لیں تو نہ قیادتِ فاسقہ کبھی ہٹ سکتی ہے اور نہ وہ قیادتِ صالحہ کبھی قائم ہو سکتی ہے جس کے قیام پر نظامِ اسلامی کا قیام منحصر ہے۔ یہ عملی انقلاب اگر رونما ہو سکتا ہے تو اسی تدریجی قدم سے ہو سکتا ہے جو ہم نے اب اٹھایا ہے" (رسالہ فتویٰ دیوبند کا تحقیقی جائزہ صفحہ ۱۱۱)

پھر مولوی رام نگری صاحب تحریر کرتے ہیں :-

(الف) "تقسیم ملک کے ساتھ جب جماعت اسلامی کی بھی تقسیم ہو گئی اور ہندوستان کی جماعت سے مولانا مودودی کے عملی تعلقات ختم ہو گئے تو اب ان کے عقائد و خیالات سے متاثر ہونے کی بحث اور بھی غلط ہے۔" (صفحہ ۱۲۶)

(ب) "لٹریچر اور نقطۂ نظر ایک ہو جانے سے دونوں جماعتیں ایک نہیں ہو جاتیں۔ اصل شے نظام جماعت ہے جو قطعاً الگ ہے۔ لہٰذا جماعت اسلامی ہند کو جماعت اسلامی پاکستان کی طرف منسوب کرنا اپنے کو مورد الزام بنانا ہے"۔ (تحقیقی جائزہ صفحہ ۱۲۱)

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ جماعتِ اسلامی قیادتِ کافرہ کو قائم رکھنا چاہتی ہے مگر قیادتِ فاسقہ کو تبدیل کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ اس مسلک کی [illegible] ہے +

جماعت اسلامی
تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ کی روشنی میں

از قلم جناب چیف جسٹس محمد منیر صاحب
و
جناب جسٹس ایم۔ آر کیانی صاحب

[پنجاب کے ۱۹۵۳ء کے فسادات کی تحقیقات کے لئے گورنمنٹ نے ایک خاص عدالت مقرر کی تھی جس کے دو ممبر تھے۔ جناب چیف جسٹس محمد منیر صاحب و جناب جسٹس ایم۔ آر کیانی صاحب۔ انہوں نے بڑی محنت و عرقریزی سے تحقیق فرمائی اور اپنے اخذ کردہ نتائج ایک رپورٹ کی صورت میں مرتب کئے۔ ذیل کا سارا مضمون لفظاً لفظاً گورنمنٹ کی شائع کردہ رپورٹ اردو سے ماخوذ ہے اس سے ظاہر ہے کہ عدالت کی تحقیقات کے رو سے جماعت اسلامی کیا ہے؟ ——— (ایڈیٹر)]

(الف) "جماعت اسلامی کی ذمہ داری کے مسئلے پر بحث کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے اغراض و مقاصد اور اس کی سرگرمیوں کے دائرے کا مختصر حال بیان کر دیا جائے۔ جماعت اسلامی تقسیم سے پہلے موجود تھی۔ اس کا صدر مقام پٹھانکوٹ ضلع گورداسپور میں تھا۔ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس کے بانی تھے تقسیم کے بعد مولانا پاکستان چلے آئے اور انہوں نے ۱۹۵۲ء میں جماعت اسلامی پاکستان کے لئے ایک نیا آئین وضع کیا۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی اب تک کام کر رہی ہے اور اس کا اپنا علیحدہ آئین ہے۔

جماعت اسلامی کا نظریہ نہایت سادہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا بھر میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کی جائے جس کا دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ ایک "دینی سیاسی" نظام قائم کیا جائے جس کو جماعت "اسلام" کہتی ہے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے وہ نہ صرف پروپیگنڈا کو ضروری سمجھتی ہے بلکہ آئینی ذرائع سے (اور جہاں ممکن ہو وہاں قوت سے) سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہاں ہے۔ جو حکومت جماعت کے تصور پر مبنی نہ ہو مثلاً جہاں اس کی بنیاد قومیت پر ہو مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک "شیطانی حکومت" اور خود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک "کفر" ہے اور تمام لوگ جو ایسی حکومت میں ملازمت یا کسی دوسری حیثیت سے حصہ لے رہے ہیں یا رضامندی سے اس نظام کی اطاعت کرتے ہیں وہ گنہگار ہیں۔ لہذا جماعت مسلم لیگ کے تصور پاکستان کی علی الاعلان مخالف تھی اور جب سے پاکستان قائم ہوا ہے جس کو "ناپاکستان" کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جماعت موجودہ نظام حکومت اور اس کے چلانے والوں کی مخالفت کر رہی ہے۔ ہمارے سامنے جماعت کی جو تحریریں پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک بھی نہیں جس میں مطالبہ پاکستان کی حمایت کا بعید سا اشارہ بھی موجود ہو۔ اسکے

بلکس یہ تحریریں جن میں کئی ممکن مفروضے بھی شامل ہیں، تمام کی تمام اس شکل کی مخالفت ہیں جس میں پاکستان وجود میں آیا اور جس میں اب تک موجود ہے۔ ایک فوجی عدالت میں اس جماعت کے بانی نے یہ بیان کیا کہ مسلح بغاوت کے سوا جماعت کا عقیدہ اور مقصد یہ ہے کہ موجودہ نظامِ حکومت کو توڑ کر جماعتِ اسلامی کے تصور کے مطابق حکومت قائم کی جائے۔ جماعت کے رئیس کو امیر کہتے ہیں اور اگرچہ اس کی رکنیت محدود ہے جس میں آجکل صرف ۹۹۹ ممبر شامل ہیں لیکن جماعت کی نشر و اشاعت کی مشینری وسیع و عریض ہے۔

ہم کسی موقع پر یہ بیان کر چکے ہیں کہ تین مطالبات مذہب پر مبنی بتائے جاتے ہیں۔ جماعت نے اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس سے انکار نہیں کیا لیکن دونوں نے احمدیوں کو اقلیت قرار دینے اور ان کو کلیدی اسامیوں سے برطرف کرنے کے بہت سے دوسرے وجوہ پر بھی زور دیا ہے۔ ان وجوہ کے اظہار میں گویا یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان مطالبات کا ایک سیاسی و مجلسی پہلو بھی ہے۔ اب اگر یہ خیال درست ہو اور مطالبات کے مذہبی پہلو کو فی الحال نظر انداز کر دیا جائے اور یہ معلوم ہو کہ جماعت ڈائرکٹ ایکشن کے فیصلے میں شریک تھی تو جماعت کا موقف یہ سمجھنا چاہیئے کہ اگر حکومت کسی عوامی مطالبہ کو منظور نہ کرے یا اس پر غور کرنے کو تیار نہ ہو تو تمام آئینی ذرائع کو بالائے طاق رکھ کر حکومت کو سول بغاوت کا الٹی میٹم دے دینا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک اس موقف کو کوئی شائستہ حکومت برداشت نہیں کر سکتی جس کو یقین ہو کہ وہ محض قوت کے بل پر نہیں بلکہ جمہور کی مرضی سے برسرِ اقتدار ہے۔ اور جب کبھی ایسی حکومت کو ایسی صورت کا سامنا ہو اس کا یہ واضح فرض ہے کہ اس الٹی میٹم کو رد کر دے اور اس کی دھمکی کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے تمام امکانی وسائل کام میں لائے۔ اگر جماعتِ اسلامی کے نزدیک ان مطالبات کے وجوہ مجلسی اور سیاسی نوعیت رکھتے ہیں تو اس کے لئے واضح راہِ عمل یہی تھی کہ وہ آئینی تحریک شروع کرتی۔ دستور ساز اسمبلی کے خیالات تبدیل کرنے کی کوشش کرتی یا آئندہ انتخابات تک انتظار کرتی اور اسی مسئلے پر الیکشن کی جنگ لڑتی۔ موجودہ حالات میں ہمارے تمام معاملات غیر حل شدہ حالت میں ہیں۔ اس حالت میں حکومت کے سینے پر پستول رکھ کر اسے کسی مطالبے کو پورا کرنے یا کوئی خاص طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کرنا نہ صرف غیر آئینی بلکہ صاف طور پر وطن دشمنی کا فعل ہے اور یہ طریقہ صرف وہی جماعت اختیار کر سکتی ہے جو حکومت کی مشکلات میں اضافہ کرنے کی خواہاں ہو۔ اگر یہ مطالبات مذہبی وجوہ پر مبنی قرار دے کر پیش نہ کئے جاتے تو ظاہر ہے کہ کوئی بحران پیدا نہ ہوتا۔ کیونکہ اس حالت میں حکومت ان مطالبات کو پیش کرنے والے فریق سے یہ خواہش ظاہر کرتی کہ وہ اپنے دعویٰ کو دلائل سے ثابت کرے تاکہ ان لوگوں کے خلاف مناسب اقدام کیا جا سکے جو مملکت کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف ہیں لیکن ان میں سے ایک مطالبہ یہ تھا کہ احمدیوں کو کلیدی عہدوں سے برطرف کیا جائے اور اس کی بنیاد صرف مذہب پر تھی کیونکہ چودھری ظفر اللہ خاں کے سوا کوئی احمدی کسی کلیدی عہدے پر فائز نہیں ہے۔ اور خود جماعت اسلامی کلیدی عہدے کی یہ تعریف کر چکی ہے کہ وہ عہدہ جس کا کام پالیسی وضع کرنا ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحی سے سوال کیا گیا کہ جب احمدیوں کو کلیدی عہدوں سے برطرف کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ان سے کون سے دوسرے عہدے مراد ہیں تو وہ کسی ایسے عہدے کا نام نہ لے سکے جس پر کوئی احمدی فائز ہو۔ اسی طرح اگر

چودھری ظفر اللہ خاں کی موقوفی کا مطالبہ اس بنا پر کیا جاتا کہ ان کی سرگرمیاں مملکت کے مفاد کے لئے مضر ہیں تو حکومت (ان کے احمدی ہونے کے علاوہ) اس امر کا قطعی ثبوت طلب کرتی کہ وہ بعض ایسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں جن کا علم وزیر اعظم کو نہیں ہے اور جن سے مملکت کو ایسا نقصان پہنچ رہا ہے کہ ان کی برطرفی ضروری ہو گئی ہے لہذا فسادات کیلئے جماعت کی ذمہ داری کے متعلق واحد سوال یہ ہے کہ آیا دوسری جماعتوں کی طرح جماعت اسلامی بھی اس فیصلے کی حامی تھی کہ اگر حکومت نے ان مطالبات کو جو بعض مذہبی عقائد پر مبنی بتائے جاتے تھے تسلیم نہ کیا تو اسکے خلاف ڈائرکٹ ایکشن شروع کر دیا جائے گا[1]"

(ب) "اب جماعت اسلامی اور اسکے بانی کی سرگرمیوں کے تفصیلی بیان کے بعد جو حقائق جماعت اسلامی نے تسلیم کئے ہیں یا اسکے خلاف ثابت ہو چکے ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) جماعت اسلامی پنجاب کی مجلس عمل کی ایک فریق تھی۔

(۲) جماعت اسلامی اس مجلس عمل کی بھی ایک فریق تھی جو کل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن نے قائم کی تھی اور جس نے ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ڈائرکٹ ایکشن کی قرارداد منظور کی تھی۔

(۳) مولانا سلطان احمد نے جو کراچی میں ۲۶ فروری کو مجلس عمل کے اجلاس میں شریک ہوئے تھے اپنے آپکو مجلس عمل کی سرگرمیوں سے منقطع نہیں کیا۔ گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کی کوٹھیوں پر رضاکاروں کو بھیجنے کا پروگرام انکی موجودگی میں طے کیا گیا لیکن انہوں نے اسکے خلاف کوئی احتجاج کیا۔

(۴) شروع سے آخر تک جماعت اسلامی کا ایک نہ ایک نمائندہ کراچی اور لاہور کی مجالس عمل کے اجلاسوں میں برابر شریک ہوتا رہا۔

(۵) ڈائرکٹ ایکشن کی قرارداد منظور ہونیکی تاریخ سے لے کر فسادات کی پوری شدت تک جماعت اسلامی نے کوئی ایسا اعلان عام نہ کیا کہ وہ ڈائرکٹ ایکشن میں شامل نہیں ہے اور ان سرگرمیوں سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتی ہے جو مجلس عمل کے طے کردہ پروگرام کی تعمیل میں جاری تھیں۔

(۶) اس شہادت کے مطابق جس پر شبہ کرنے یا جس کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ۵ مارچ کو مولانا مودودی نے گورنمنٹ ہاؤس میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ حکومت اور عوام کے درمیان خانہ جنگی جاری ہے۔ اور جب تک حکومت قوت کے استعمال کو روک کر عوام کے نمائندوں سے مذاکرات شروع نہ کرے امن و امان کی اپیل جاری کرنے کیلئے موقع نہیں اور

(۷) جماعت اسلامی نے اپنی قرارداد مورخہ ۵ مارچ میں اسی رائے کو دہرایا جو اسی دن مولانا مودودی نے گورنمنٹ ہاؤس میں ظاہر کی تھی۔

جماعت کو خوب معلوم تھا کہ "ڈائرکٹ ایکشن" کے پروگرام سے نہایت خوفناک قسم کے فسادات رونما ہونگے کیونکہ مولانا مودودی نے اپنی بعض تقریروں میں جو "تسنیم" میں شائع ہوئیں لفظ "جنگ" استعمال کیا ہے اور ۲۰ جنوری کو لاہور میں موچی دروازے کے باہر تقریر کرتے ہوئے ہندو مسلم فسادات کا حوالہ بھی دیا۔

۵ مارچ سے پہلے تسنیم کی مختلف تحریرات اور جماعت اسلامی کی جاری کردہ ہدایات میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ جماعت ڈائرکٹ ایکشن کے پروگرام کی حامی یا مؤید نہیں ہے۔ اسکے برعکس ان تحریروں میں اس حقیقت کا چھپا ہوا اعتراف کیا گیا ہے کہ جماعت اسلامی نے اس معاملے میں ایک خاص ذمہ داری لے لی ہے جس کو پورا کرنے میں وہ اپنی بہترین قابلیت صرف کریگی۔ اس سے حافظ خادم حسین کی اس شہادت کی تائید ہوتی ہے کہ جماعت اسلامی اور دوسرے فرقوں کے درمیان تقسیم کار کی کوئی سکیم موجود تھی جس کے قرائن مولانا امین احسن اصلاحی کے اس بیان میں پائے جاتے ہیں کہ جماعت کا پروگرام تقریریں کرنا اور لٹریچر شائع

[1] رپورٹ صفحہ ۲۶۲-۲۶۱

کرتا ہے۔ لہٰذا پھر بھی اگر یہ مان لیا جائے اور ہم یقین کرلیں کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بیان کا یہ حصہ صحیح ہے اور جماعت اسلامی اور دوسرے فرقوں کے درمیان ڈائرکٹ ایکشن کے پروگرام کی تفصیلات کے متعلق اختلافات تھے اور جماعت آئینی ذرائع اختیار کرنے پر مُصر تھی پھر بھی اس امر کی حیثیت مجلس عمل کے ممبروں کے درمیان ایک گھریلو اور داخلی معاملے کی تھی اور اس سے اس ڈائرکٹ ایکشن کے قدرتی نتائج کے متعلق جماعت کی ذمہ داری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جماعت اسلامی ڈائرکٹ ایکشن کے فیصلے میں سنجیدگی سے شامل تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر جماعت نے علی الاعلان اور وضاحت کے ساتھ اپنے آپکو ڈائرکٹ ایکشن کے پروگرام سے بے تعلق کرلیا ہوتا تو وہ ان واقعات کی ذمہ دار نہ ہوتی جو بعد میں رونما ہوئے۔ لیکن اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ جماعت نے ڈائرکٹ ایکشن سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کیا ہو۔ اس کی نامنظوری ظاہر کی ہو یا اس کی مذمت کی ہو۔ محض جلوسوں کی ترتیب کے انداز کو یا بنا وٹی جنازے نکالنے کو یا جلوسوں میں تقریروں پر نعرے لگانے کو ناپسند کرنے کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ ڈائرکٹ ایکشن کی مذمت کی گئی تھی یا ان تدابیر کو ناواجب قرار دیا گیا تھا جو ۲۶ فروری کے اجلاس میں اس اقدام کی تعمیل کے لئے طے ہوئی تھیں۔ اور جب جماعت اسلامی کے لیڈر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے حکومت کی ان سرتوڑ کوششوں میں جو وہ ۵ مارچ کو فسادات کے روکنے کے لئے کر رہی تھی کسی قسم کا تعاون پیش نہ کیا تو ہمارے نزدیک جماعت کی ذمہ داری میں بہت بڑا اضافہ ہو گیا۔ بلکہ اسکے برعکس مولانا نے سرکشانہ رویہ اختیار کیا۔ تمام واقعات کا الزام حکومت پر عائد کیا اور فسادیوں کو "تشدد کا شکار" کہہ کر ان سے عام ہمدردی پیدا کرنیکی کوشش کی۔ گورنمنٹ ہاؤس میں انہوں نے جو رویہ اختیار کیا اسکے متعلق جو شہادت پیش ہوئی اس سے ہم یہ اثر قبول کرسکتے ہیں کہ وہ پورے نظام حکومت کے انہدام کی توقع کر رہے تھے اور حکومت کی متوقع پریشانی اور بدحالی پر بغلیں بجا رہے تھے۔ اور اگر اسکے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھ لی جائے کہ جماعت اسلامی کا مقصد اقتدار حاصل کرنا ہے کیونکہ اسکے خیال کے مطابق اللہ کی حاکمیت کے ماتحت مذہبی اداروں کے قیام کا مقصد حاصل کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ یہی ہے تو اس میں ذرا بھی شبہ باقی نہیں رہتا کہ جو کچھ ہو رہا تھا اسے جماعت اسلامی کی پوری تائید و حمایت حاصل تھی۔ لہٰذا ڈائرکٹ ایکشن کی منظوری سے اور اس پروگرام سے جو مجلس عمل نے کراچی میں ۲۶ فروری کو طے کیا تھا کہ گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کی کوٹھیوں پر رضاکاروں کے دستے بھیجے جائیں اور مولانا ابوالحسنات کو تحریک کا پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا جائے۔ جو طبعی نتائج پیدا ہوئے ان کی ذمہ داری جماعت پر بھی عائد ہوتی ہے۔ تحریک کے لیڈروں کی گرفتاریاں ناگزیر ہو چکی تھیں اور مجلس عمل مؤرخہ ۲۶ فروری کی کارروائی میں پہلے ڈکٹیٹر کی امکانی گرفتاری کا جو ذکر موجود ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ لیڈروں کو بھی اس معاملے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا۔ جو واقعات گرفتاریوں کے بعد رونما ہوئے وہ چونکہ متوقع تھے اور یہ بھی معلوم تھا کہ عام احتجاجوں اور مظاہروں سے جو صورت حالات پیدا ہوگی اس کی درستی کے لئے حکام کیا تدابیر اختیار کریں گے اسلئے جماعت کی طرف سے یہ دعویٰ بالکل نازیبا ہے کہ سارا الزام حکومت پر عائد ہوتا ہے کیونکہ اس نے ان فسادات کو فرو کرنے کے لئے جو نہایت سرعت سے نہایت تشویش انگیز صورت اختیار کر رہے تھے قوت کا استعمال کیا۔ سید فردوس شاہ کو ۴ مارچ کی شام کو ایک تصفیہ کی ہجوم نے مسجد وزیر خاں کے

اندر یا باہر قتل کر دیا۔ یہ بعد میں ہونے والے واقعات کا محض ایک پیش خیمہ تھا لیکن اس حادثے کے بعد بھی جماعتِ اسلامی نے نہ اظہارِ تاسف کیا نہ اس وحشیانہ قتل کی مذمت میں ایک لفظ کہا بلکہ اسکے برعکس اس جماعت کے بانی نے آگ اور خون کے اس ہولناک ہنگامے کے درمیان "قادیانی مسئلہ" کا بم پھینکدیا۔ ہمارے نزدیک جماعت کے ذہن کی کیفیت صحیح صحیح یہ تھی کہ اگرچہ وہ اس پروگرام کو جائز نہ سمجھتی تھی جو ڈائرکٹ ایکشن کی قرارداد کی تعمیل کے لئے طے ہوا تھا لیکن وہ شروع سے آخر تک لوگوں کے سامنے اپنے حقیقی خیالات کا دلیرانہ اور بااصرار اعلان اس خوف کی وجہ سے نہ کر سکی کہ مبادا وہ عوام میں غیر ہر دلعزیز ہو جائے۔ لہذا وہ اپنی ذہنیت اور اپنے رویے کے اعتبار سے کسی دوسری سیاسی شخصیت یا انجمن سے مختلف نہ تھی اور دوسروں ہی کی مانند ہر ایسے اقدام سے خائف تھی جو اسے عوامی تنقید کا نشانہ بنا دے۔"[1]

(ج) "جب ہم ذمہ داری کے مسئلے پر توجہ کریں گے تو ہم یہ ضرور بتائیں گے کہ جو جماعتیں آج تینوں مطالبات کو مذہبی وجوہ کی بنا پر نافذ کرانے کے لئے تقاضا کر رہی ہیں ان میں سے اکثر خود اسلامی مملکت کے تصور کی مخالف ہیں۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کا خیال بھی یہی ہے کہ اگر کبھی یہ "مسلم مملکت" وجود میں آگئی تو اس میں حکومت کی ہیئت صرف سیکولر (غیر مذہبی) ہی ہو سکتی ہے۔"[2]

(د) "مولانا ابو الاعلیٰ مودودی امیر جماعتِ اسلامی:۔

سوال۔ اِزراہِ کرم مسلم کی تعریف کیجئے۔

جواب۔ وہ شخص مسلم ہے جو (۱) توحید پر (۲) تمام انبیاء پر (۳) تمام الہامی کتابوں پر (۴) ملائکہ پر (۵) یوم الآخرۃ پر ایمان رکھتا ہو۔

سوال۔ کیا ان باتوں کے محض زبانی اقرار سے کسی شخص کو مسلم کہلانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور آیا ایک مسلم مملکت میں اس سے وہ سلوک کیا جائے گا جو مسلمان سے کیا جاتا ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہوں تو کیا کسی شخص کو اس کے عقیدے کے وجود پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے؟

جواب۔ جو پانچ شرائط میں نے بیان کی ہیں وہ بنیادی ہیں جو شخص ان شرائط میں سے کسی شرط میں کوئی تبدیلی کریگا وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیگا۔"[3]

مولانا امین احسن اصلاحی:۔

سوال۔ مسلمان کون ہے؟

جواب۔ مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سیاسی مسلمان۔ دوسرے حقیقی مسلمان۔ سیاسی مسلمان کہلانے کی غرض سے ایک شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ۔

(۱) توحید الٰہی پر ایمان رکھتا ہو

(۲) ہمارے رسول پاک کو خاتم النبیین مانتا ہو یعنی اپنی زندگی کے متعلق تمام معاملات میں انکو آخری سند تسلیم کرتا ہو۔

(۳) ایمان رکھتا ہو کہ ہر خیر و شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے

(۴) روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔

(۵) قرآن مجید کو آخری الہام الٰہی یقین کرتا ہو۔

(۶) مکہ معظمہ کا حج کرتا ہو۔

(۷) زکوٰۃ ادا کرتا ہو۔

(۸) مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتا ہو۔

(۹) اسلامی معاشرے کے ظاہری قواعد کی تعمیل کرتا ہو۔

(۱۰) روزہ رکھتا ہو۔

[1] رپورٹ صفحہ ۲۶۰-۲۶۱ ۔ [2] رپورٹ صفحہ ۲۱۹ ۔ [3] رپورٹ صفحہ ۲۳

جو شخص ان تمام شرائط کو پورا کرتا ہو وہ ایک اسلامی مملکت کے پوری شہری کے حقوق کا مستحق ہے۔ اگر وہ ان میں سے کوئی ایک شرط پوری نہ کریگا تو وہ سیاسی مسلمان نہ ہوگا۔ (پھر کہا) اگر کوئی شخص ان دس امور پر ایمان کا محض اقرار ہی کرتا ہو گو ان پر عمل کرتا ہو یا نہ کرتا ہو تو یہ اسکے مسلمان ہونے کے لئے کافی ہے۔

حقیقی مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ اور رسول اللہ کے تمام احکام پر عین اس طرح ایمان رکھتا ہو اور عمل کرتا ہو جس طرح وہ احکام و ہدایات اس پر عائد کئے گئے ہیں۔

سوال ۔ کیا آپ یہ کہیں گے کہ صرف حقیقی مسلمان ہی "مرد صالح" ہے ؟

جواب ۔ جی ہاں۔

سوال ۔ اگر ہم آپ کے ارشاد سے یہ سمجھیں کہ آپ کے نزدیک سیاسی مسلمان کہلانے کے لئے صرف عقیدہ کافی ہے اور حقیقی مسلمان بننے کے لئے عقیدے کے علاوہ عمل بھی ضروری ہے تو آپکے نزدیک ہم نے آپکا مفہوم صحیح طور سے سمجھا ہے۔

جواب ۔ جی نہیں ۔ آپ میرا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھے سیاسی مسلمان کے معاملے میں بھی عمل ضروری ہے ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان عقائد کے مطابق عمل نہیں کرتا جو ایک سیاسی مسلمان کے لئے ضروری ہیں تو وہ سیاسی مسلمانوں کے دائرے سے خارج ہو جائیگا۔

سوال ۔ اگر کوئی سیاسی مسلمان ان باتوں پر ایمان نہ رکھتا ہو جن کو آپ نے ضروری بتایا ہے تو کیا آپ اس شخص کو بے دین کہیں گے ؟

جواب ۔ جی نہیں ۔ میں ایسے شخص بے عمل کہوں گا۔

صدر انجمن احمدیہ ربوہ کی طرف سے جو تحریری بیان پیش کیا گیا اس میں مسلم کی تعریف یہ کی گئی کہ مسلم وہ شخص ہے جو رسول پاک صلعم کی اُمت سے تعلق رکھتا ہو اور کلمہ طیبہ پر ایمان کا اقرار کرتا ہے۔

ان متعدد تعریفوں کو جو علماء نے پیش کی ہیں پیش نظر رکھ کر کیا ہماری طرف سے کسی تبصرے کی ضرورت ہے بجز اسکے کہ دین کے کوئی دو عالم بھی اس بنیادی امر پر متفق نہیں ہیں ۔ اگر ہم اپنی طرف سے "مسلم" کی کوئی تعریف کر دیں جیسے ہر عالم دین نے کی ہے اور وہ تعریف ان تعریفوں سے مختلف ہو جو دوسروں نے پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا اور اگر ہم علماء میں سے کسی ایک کی تعریف کو اختیار کرلیں تو ہم اس عالم کے نزدیک تو مسلمان رہینگے لیکن دوسرے تمام علماء کی تعریف کے رُو سے کافر ہو جائیں گے۔"[له]

(ھ) یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مختصر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالے سے اور بعض دوسری پیش شدہ تحریرات سے جن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی کتابیں بھی شامل ہیں عقیدہ جہاد کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ اسلام اسلحہ اور فتوحات کے زور سے پھیلا ہے اب جارحیت اور نسل کشی انسانیت کے خلاف جرائم قرار پا چکے ہیں ۔ اور انہی جرائم کی بنا پر نیورمبرگ اور ٹوکیو کی مختلف بین الاقوامی عدالتوں نے جرمنی اور جاپان کے ارباب جنگ کو موت کی سزائیں دی ہیں ۔ ایک طرف جارحیت اور نسل کشی کے جرائم ہیں اور دوسری طرف یہ عقیدہ ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر اور بزور فتوحات پھیلا ہے ۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟"[ٹه]

(و) "ہم نے مختلف علماء سے یہ سوال کیا کہ اگر پاکستان

له رپورٹ ص۲۳۲ و ص۲۳۵ ۔ ٹه رپورٹ ص۲۲۷ ۔

پر غیر مسلموں کے ساتھ شہریت کے معاملات میں مسلموں سے مختلف سلوک کیا جائے تو کیا علماء کو اس امر پر کوئی اعتراض ہوگا کہ دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ روا رکھا جائے۔ اس سوال کے جوابات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی:۔

سوال۔ اگر ہم پاکستان میں اس شکل کی اسلامی حکومت قائم کرلیں تو کیا آپ ہندوؤں کو اجازت دیں گے کہ وہ اپنے دستور کی بنیاد اپنے مذہب پر رکھیں؟

جواب۔ یقیناً مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ حکومت کے اس نظام میں مسلمانوں سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے۔ ان پر منو کے قوانین کا اطلاق کیا جائے۔ اور انہیں حکومت میں حصہ اور شہریت کے حقوق قطعاً نہ دئیے جائیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی ہندوستان میں صورت حالات یہی ہے۔

میاں طفیل محمد (جماعت اسلامی)

سوال۔ دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کس قدر ہے؟

جواب۔ پچاس کروڑ۔

سوال۔ اگر آپ کے قول کے مطابق مسلمانانِ عالم کی کل آبادی پچاس کروڑ ہے اور پاکستان، سعودی عرب، یمن، انڈونیشیا، مصر، ایران، شام، لبنان، شرق اردن، ترکی اور عراق کے مسلمانوں کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ نہیں تو کیا آپ کے نظریے کا یہ نتیجہ نہ ہوگا۔ کہ تیس کروڑ مسلمانانِ عالم لکڑی کاٹنے اور پانی بھرنے والے بن جائیں گے۔

جواب۔ میرے نظریے کا اثر ان کی حیثیت پر نہ ہونا چاہیئے۔

سوال۔ کیا اس حالت میں بھی کہ ان سے مذہبی بناء پر غیر مساوی سلوک کیا جائے اور معمولی حقوقِ شہریت سے بھی محروم کردیا جائے؟

جواب۔ جی ہاں۔

اس گواہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم حکومت اپنے ملک کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو اسامیاں پیش بھی کرے تو ان کا فرض ہوگا کہ ان کو قبول کرنے سے انکار کردیں۔[1]

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی:۔

سوال۔ ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ ہونے کی حالت میں مسلمانانِ ہند کا فرض کیا ہوگا؟

جواب۔ ان کا فرض ظاہر ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف نہ لڑیں اور نہ کوئی ایسا فعل کریں جو پاکستان کی سلامتی کے لئے مضر ہو۔[2]

(س) "ہم نے علماء سے سوال کیا کہ آیا مملکت کا یہ تصور ان کے نزدیک قابلِ قبول ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے بلا تامل اس کا جواب نفی میں دیا۔ اور ان میں احرار اور وہ سابق کانگرسی بھی شامل تھے جو تقسیم سے پہلے اس تصور کو قریب قریب جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔ اگر مولانا امین احسن اصلاحی کی شہادت جماعتِ اسلامی کے نقطۂ نگاہ کی صحیح مظہر ہے تو جو مملکت اس نصب العین پر مبنی ہو وہ ابلیس کی مخلوق ہے۔ ان کے اس خیال کی تصدیق جماعت کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی بے شمار تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔ علماء میں سے کوئی بھی ایسی مملکت کو برداشت نہیں کرسکتا

---

[1] رپورٹ ص۲۲۵-۲۲۱ [2] رپورٹ ص۲۲۷

جس کی بنیاد قومیت پرستی اور اس کے متعلقات پر ہو۔ ان کے نزدیک مملکت کی فعالیت کو متعین کرنے کی اہلیت صرف "ملت" اور اس کے متعلقات میں ہے کہا جاتا ہے کہ قائدِ اعظم نے ایک عصری قومی مملکت کا جو تصور پیش کیا تھا وہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرارداد مقاصد منظور ہو جانے کے بعد متروک ہو گیا۔ لیکن یہ بھی کھُلم کھُلا تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ قرارداد اگرچہ الفاظ و فقرات کے اعتبار سے بہت بلند بانگ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں محض دھوکا ہے اور اس میں نہ صرف مملکتِ اسلامی کا ہیولےٰ تک شامل نہیں بلکہ اس کی دفعات خصوصاً جو بنیادی حقوق سے متعلق ہیں واضح طور پر مملکتِ اسلامی کے اصولوں کے منافی ہیں"[۱]

(ص) " میاں طفیل احمد نے حسبِ ذیل بیان دیا:۔

سوال :- اقلیتوں کے حقوق کے متعلق جو مضمون سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے اس کو پڑھ کر بتائیے کہ آیا اس میں اسلامی مملکت کے متعلق آپ کے خیالات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ (اس مضمون میں بیان کیا گیا تھا کہ اقلیتوں کے حقوق مسلمانوں کے برابر ہوں گے)

جواب۔ میں نے یہ مضمون پڑھ لیا ہے۔ اگر پاکستان میں جماعت کے نظریے پر مبنی مملکت قائم کی جائے تو میں پاکستان میں عیسائیوں یا دوسرے غیر مسلموں کے ان حقوق کو تسلیم نہیں کرونگا۔

اس نکتے پر مولانا عبد الحامد بدایونی کی ذہنی ژولیدگی مندرجہ ذیل بیان سے ظاہر ہو گی :۔

سوال ۔ کیا آپ نے کبھی مذکورہ بالا تقریر کو پڑھا ہے؟ (قائدِ اعظم کی وہ تقریر جو انہوں نے ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں کی تھی)

جواب ۔ جی ہاں ۔ میں نے وہ تقریر پڑھی ہے۔

سوال ۔ کیا آپ اب تک پاکستان کے اس تصور سے اتفاق کرتے ہیں جو قائدِ اعظم نے دستور ساز اسمبلی کی تقریر میں پیش کیا تھا ۔ اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ آج کے بعد صرف ایک پاکستانی قوم ہو گی ۔ جس میں مُسلم اور غیر مُسلم شامل ہونگے۔ ان سب کو مساوی شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ نسل، مذہب اور مسلک کا کوئی امتیاز نہ ہو گا اور مذہب محض فرد کا نجی معاملہ سمجھا جائے گا؟

جواب ۔ میں اس اصول کو تسلیم کرتا ہوں کہ تمام قوموں کو خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم مملکت کے نظم و نسق اور قانون سازی میں ان کی آبادی کے مطابق نمائندگی حاصل ہونی چاہیئے۔ سوائے اسکے کہ غیر مسلم شعبۂ فوج اور محکمۂ عدالت میں نہ لئے جاسکیں گے ۔ نہ وزیر مقرر کئے جاسکیں گے اور نہ کسی اعتماد کے عہدے پر فائز ہو سکیں گے ۔

سوال ۔ کیا آپ کا مقصد اس سے یہ ہے کہ غیر مسلموں کا موقف ذمیوں کا سا ہو گا یا اس سے بہتر ہو گا؟

جواب ۔ جی نہیں ۔ ذمیوں سے مراد اُن ملکوں کی غیر مسلم آبادی سے ہے جن کو کسی اسلامی مملکت نے فتح کیا ہو ۔ اس لفظ کا اطلاق ان غیر مسلم اقلیتوں پر نہیں ہو سکتا جو کسی اسلامی مملکت میں پہلے سے آباد ہوں ۔ ایسی اقلیتیں معاہد کہلاتی ہیں (یعنی وہ لوگ جن سے کوئی معاہدہ کیا گیا ہو)"[۲]

[۱] رپورٹ ص۲۱۷

[۲] رپورٹ ص۲۳

جماعتِ اسلامی کی تاریخ

(پاکستان سے پہلے)

—— از قلم جناب شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے ——

[ذیل کا اہم مقالہ جناب شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے کا تحریر کردہ ہے۔ اصل مضمون میں سے "کوثر کے تیر و نشتر" والے حصہ کو حذف کر کے باقی سارا مقالہ درج ذیل ہے۔ محترم شیخ صاحب کی کتاب "جماعت اسلامی پر ایک نظر" اس سلسلہ میں ایک اہم کتاب ہے —— (ایڈیٹر)]

پہلی جماعتِ اسلامی

مولنا مسعود عالم ندوی کی تالیف "مولانا سندھی کے افکار و خیالات پر ایک نظر" کے مقدمے میں مولنا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :-

"جنگِ عظیم کے بعد سے جو مسلمان نوجوان یورپ کو گئے وہ کمیونزم یا نازی ازم میں سے کسی ایک کا شکار ہو آئے۔ پہلا نظریہ دہلی کے خیری برادرس کی جماعتِ اسلامی اور علامہ مشرقی صاحب کی خاکسار تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خیری بھائیوں کی تحریک تو ان کے گھر کی چار دیواری ہی میں محدود رہی۔ ان کا بڑا زور وحدتِ آمریت پر تھا لیکن مذہبی اصول و فروع میں انہوں نے تاویل نہیں کی۔

ان سطور کے متعلق جماعت اسلامی کا اخبار کوثر لکھتا ہے۔

"جماعت اسلامی کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے بھائی ابوالخیر مودودی بھی دہلی کے رہنے والے ہیں اور ابوالخیر کی مناسبت سے ان پر خیری برادرس کا دھوکا ہوتا ہے حالانکہ خیری برادرس ایک دوسرا گھرانا ہے جس سے مولانا عبدالجبار خیری، مولانا عبدالغفار خیری اور پروفیسر عبدالستار خیری مرحوم مراد ہیں۔ پروفیسر عبدالستار خیری مرحوم جرمنی گئے تھے۔ مولانا عبدالجبار اس نظریے کے معتقد تھے جس کی طرف مولانا سید سلیمان ندوی نے اشارہ فرمایا ہے۔ انہوں نے ایک جماعتِ اسلامی کی داغ بیل بھی ڈالی۔ مولانا ابوالاعلیٰ کو بھی دعوت دی تھی۔ مگر مولانا وحدتِ آمریت اور بعض دوسرے امور میں اتفاق نہ کر سکے۔ اور مولانا عبدالجبار اور ان کے بھائی اپنے نظریے کے مطابق اپنی راہ پر چلے گئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے"

کوثر نے تو خیری برادرز، مولانا مودودی کو ان کی دعوت اور دعوتوں کے بعض اختلافات کا ذکر چند لفظوں میں کیا ہے لیکن دہلی کے باخبر و معتبر حضرات کا قول ہے کہ مولانا مودودی ایک مدت تک خیری برادرز کے جلسوں میں گاہے گاہے شریک ہوتے رہے۔ جماعتی تنظیم اور پراپگنڈا کے جو اصول مولانا عبدالستار خیری جرمنی سے سیکھ کر آئے تھے وہ ان سے اخذ کئے۔ انہوں نے مولانا عبدالجبار خیری کی وحدتِ آمریت پر تو آمنا و صدقنا نہ کہا لیکن جو تحریک خود انہوں نے بعد میں چلائی اس میں خیری برادرز کی تحریک کی بہت سی خصوصیات شامل تھیں۔ چنانچہ جماعت کا نام جوں کا توں وہی ہے جو بقول سید سلیمان ندوی دایڈیٹر کوثر خیری برادرز نے اپنی جماعت کا رکھا تھا یعنی "جماعتِ اسلامی"۔

مولانا مودودی کے متعلق ان کے ایک ہم عمر واقفِ حال کی تفصیلی تحریر

مولانا مودودی نے اپنی جماعتِ اسلامی کی بنیاد ۱۹۴۱ء میں رکھی جب ان کی عمر ۳۸ سال کی تھی۔ اس سے پہلے بھی انہوں نے کئی صحافتی اور اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ مولانا کے خیالات اور رجحانات کا اندازہ لگانے کے لئے اس پس منظر پر بھی نظر ڈالنی ضروری ہے اور اس مقصد کے لئے شاید ذیل کا خط دلچسپی سے

پڑھا جائے جو اخبار جنگ (کراچی) میں ۱۴ نومبر ۱۹۴۹ء کو شائع ہوا تھا:-

مَیں مولانا مودودی کو جانتا ہوں

آپ کے مؤقر اخبار میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی بابت بہت سے خطوط شائع ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والوں میں سے کوئی بھی سید صاحب سے پوری طرح واقف نہیں۔ مَیں مودودی صاحب کو ۲۵ سال سے جانتا ہوں اور ان کے تمام حالات سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ اسلئے مناسب سمجھتا ہوں کہ مَیں بھی کچھ عرض کر دوں۔ اختصار کے خیال سے پورے حالات تو بہرحال نہیں دیئے جاسکتے۔ مختصر عرض ہے کہ حصولِ علم و فضل کے بعد مودودی صاحب کی عملی زندگی کا آغاز جمعیت العلمائے ہند کے اخبار الجمعیۃ کی ایڈیٹری سے ہوتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جمعیت العلمائے ہند اوّل درجہ کی کانگریسی جماعت ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب بھی اس وقت پکے کانگریسی اور مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔ چند سال بعد الجمعیۃ کی مالی حالت خراب ہوجانے کی وجہ سے چونکہ سید صاحب کو چھ چھ ماہ تک تنخواہ نہ ملتی تھی وہ وہاں سے الگ ہوگئے اور بظاہر کانگریس سے بھی۔ لیکن لیگ سے اختلاف کبھی نہ گیا بلکہ اب تک موجود ہے۔ مودودی صاحب کو ہمیشہ ہی سے اپنے علم و فضل کے متعلق بے انتہا خوش فہمی رہی ہے اور وہ ابتدائے عمر سے لیڈر بننے اور رہنمائے مسلم قوم کی خدمت کرنے کا تہیہ کرچکے تھے۔ دہلی کے بعد وہ اسی خیال سے حیدرآباد تشریف لے گئے اور کئی سال تک وہاں سے ایک رسالہ نکالتے رہے اور بہت سی کتابیں بھی شائع کیں جو سب کی سب مذہبی اصلاح کے خیال سے تحریر کی گئی تھیں۔ بڑی کوششوں کے بعد پٹھان کوٹ میں آپ نے ایک دارالاسلام قائم کیا جو تقسیم ہند تک قائم رہا۔ اس کے بعد وہ اپنے رفقائے کار سمیت پاکستان تشریف لے آئے۔ اس دوران میں آپ نے ایک جماعت قائم کرلی تھی جس کا نام اسلامی جماعت ہے لیکن یہ جماعت بنانے سے پہلے مودودی صاحب اس بات کے سخت مخالف تھے کہ مذہبی لائنوں پر مذہبی نام سے کوئی جماعت بنائی جائے کیونکہ اس سے اسلام میں فرقہ بندی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن تجربہ کے بعد آپ کو یہ رائے بدلنی پڑی۔ اس جماعت کا عقیدہ ہے (گو اس کا علی الاعلان اظہار نہیں کیا جاتا) کہ اس وقت روئے زمین پر کہیں بھی کوئی ایسا مسلمان موجود نہیں جو حقیقت میں مسلمان ہو۔ کیونکہ مودودی صاحب کی رائے میں مسلمان صرف وہی ہے جو خود رسول اکرمؐ یا حضورؐ کے صحابہ کیا ر جیسا متقی اور متورع ہو۔ اس جماعت کے ارکان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ مودودی صاحب یا ان کے کسی خلیفہ کے ہاتھ پر مسلمان پکا اور سچا مسلمان ہو سکتا ہے۔

جہاں تک سیاسی خیالات کا تعلق ہے پہلے وہ سخت کٹر کانگریسی تھے پھر الجمعیۃ کے ساتھ ساتھ کانگریس سے بھی الگ ہوگئے لیکن مسلم لیگ کے ہمیشہ مخالف رہے اور اب تک سخت مخالف ہیں۔ آپ کا قول ہے کہ مسلم لیگی سب کے سب مغربیت زدہ لوگ ہیں۔ ان کی نظر، ان کا دل، ان کے خیالات سب کے سب مغربی ہیں جن کو اسلام سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ مسلم لیگ نے قیامِ پاکستان کے واسطے جو جہاد کیا ہے آپ اس کے بھی مخالف تھے۔ گو کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی جماعت کو یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ اپنے آپ کو غیر جانبدار رکھیں لیکن جتنے "اسلامی" بھائیوں سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا سبھی کو قیام پاکستان کے خلاف پایا۔ اور اس اختلاف کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ لوگ جو پاکستان کی بنیاد ڈال رہے ہیں سچے مسلمان نہیں۔ لیکن اب جو پاکستان بن گیا تو مودودی صاحب اور آپ کی جماعت سب کی یہ خواہش ہے کہ اس کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

مسلمان قوم کی تباہی کے ہزاروں اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ بہت کم مسلمانوں کو اپنی صحیح قدر و قیمت معلوم ہے۔ مودودی صاحب کو حقیقت میں اتنا بھی تو معلوم نہیں کہ آجکل حکومت کرنے کے لئے کن کن علوم میں مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کے نام کیا کیا ہیں۔ مودودی صاحب کی

پاکستان دشمنی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے جہادِ کشمیر جیسی ضروری اور متبرک تحریک کے خلاف فتویٰ دیا اور جو فقہی عذر لنگ پیش کیا اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو فنِ حکومت کی ا-ب-ت بھی نہیں آتی۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد عثمانی سے خط و کتابت کرنے کے بعد آپ نے اپنی غلطی یا دوسرے الفاظ میں علمی ناواقفیت کا اقرار بھی کر لیا۔ اب قارئین کرام خود فیصلہ کر لیں کہ ہم پاکستانی اپنے عزیز وطن کی تقدیر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں کس طرح دے سکتے ہیں۔ ہمارے وطنِ عزیز کی عمر ابھی صرف دو سال رہی ہے۔ باہر چاروں طرف دشمنوں سے گھرا ہوا ہے اور اندر ہزاروں جاسوسوں سے بھرا ہوا ہے۔

ہم مودودی صاحب اور آپ کی جماعت سے بہت عاجزانہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ حکومت کرنے کی بجائے مسلمانوں کے اخلاق کی اصلاح کی کوشش کریں اور اندر اسلامی تعلیم پھیلائیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ملک کو بھی فائدہ ہوگا اور پبلک خود بخود ان کو حکومت کے تخت پر لا کر بٹھا دے گی۔

(محمد محترم انصاری کراچی)

اس مکتوب میں واقعات کے بیان کرنے میں ایک دو جزوی غلطیاں ہوئی ہیں لیکن یہ خط ایک ایسے بزرگ کا لکھا ہوا ہے جو مولانا کو پینتیس ۳۵ برس سے جانتے ہیں۔ انہوں نے اپنا نام اور مقام بھی دیا ہے اور اخبار جنگ نے جو عام طور پر جماعتِ اسلامی کا ہمدرد اور حامی ہے اسے شائع کیا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہم نے اسے پورا نقل کر دیا لیکن مکتوب نگار کا یہ خیال کہ مولانا پہلی مرتبہ پبلک کے سامنے الجمعیۃ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آئے صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس سے کچھ عرصہ پہلے مولانا مودودی جبلپور میں ایک کانگریسی اخبار کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ اس کی تصدیق بمبئی کے مشہور کانگریسی اور احراری لیڈر مسٹر علی بہادر خاں کے اخبار ہلالِ نو کے اس اقتباس سے ملتی ہے۔

"۲۸ برس قبل جب جبلپور میں مولانا مودودی کے ایک مقالہ پر "تاج" کے پرنٹر پبلشر گرفتار ہوئے تو مولانا مودودی جو "تاج" کے ایڈیٹر تھے گرفتاری سے بچنے کے لئے یکایک دہلی روانہ ہوگئے اور ان کے اس فعل کی وجہ سے راقم الحروف کا مستقبل کچھ سے کچھ ہو گیا۔ جبلپور کے قوم پرست مسلمانوں اور کانگریسی ہندوؤں نے مجھے "تاج" کی ادارت پیش کی اور میں نے قبول کر لی۔ یہاں سے میری صحافت کا دور شروع ہوتا ہے۔ نہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اس اخبار کی ادارت چھوڑ کر یکایک جبلپور سے روانہ ہو جاتے نہ میں اس پیشے میں قدم رکھتا۔ ان کے جیل سے بچنے کے جذبہ نے میری زندگی کو بدل ڈالا۔"

(ہلالِ نو بمبئی ۱۰ را کتوبر ۱۹۵۴ء)

مولانا مودودی کے ابتدائی ایام

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی

۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء کو بمقام اورنگ آباد پیدا ہوئے۔ والد ریاست حیدرآباد میں ملازم تھے اور مولانا کی زندگی کے پہلے تیرہ چودہ سال اورنگ آباد میں گذرے۔ پھر والد پنشن لیکر اپنے آبائی وطن دہلی میں آ مقیم ہوئے اور مولانا بھی یہاں آ گئے۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ گیارہ برس کی عمر میں مدرسہ فوقانیہ میں داخل ہوئے۔ لیکن والد کی وفات پر رسمی تعلیم کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ البتہ مشہور ہے کہ غیر رسمی طور پر آپ کی علمی رہنمائی مولوی عبد السلام نیازی (ترکمان دروازے والوں) نے کی، آپ رامپور کے مشہور معقولی تھے۔ مولانا کا لڑکپن سے اس حلقے میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا جس میں قاری سرفراز حسین فلیقی دہلوی، نثار دہلوی اور نیاز فتحپوری کبھی کبھی شریک ہوتے تھے۔ فلیقی اور نیاز کے زیر اثر انہوں نے طرزِ تحریر پر توجہ کی تو مولوی عبد السلام کے اثر سے ان پر منطق اور معقولات کا وہ رنگ چڑھا جو عام طور پر علمائے دہلی کا خصوصی وصف نہیں۔ مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ العلمائے ہند ان میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ انہی کی سعی سے وہ جمعیۃ العلمائے ہند کے دفتر سے وابستہ ہوئے۔

"الجہاد فی الاسلام"

مولانا الجمعیۃ کے دفتری کام انجام دے رہے تھے کہ دسمبر ۱۹۲۶ء کی آخری

تاریخوں میں سوامی شردھانند کو ایک مسلمان نے قتل کر دیا۔ یہ واقعہ غیر مسلموں کے لئے بہانہ بنا۔ انہوں نے تمام امتِ اسلامیہ بلکہ خود اسلامی تعلیمات کو اس واقعہ کا ذمہ دار قرار دینا شروع کیا۔ اور قرآن کریم کے خلاف اس قسم کے الزامات عائد کرنے لگے کہ اس کی تعلیم مسلمانوں کو خونخوار و قاتل بناتی ہے۔ اس کی تعلیم امن وامان اور مسالمت کے خلاف ہے۔ اور اس کی تعلیم نے مسلمانوں کو اتنا متعصب بنا دیا ہے کہ وہ ہر کافر کو گردن زدنی سمجھتے ہیں۔"
مولانا نے ان خیالات کی تردید کے لئے الجمعیۃ میں ایک سلسلہ مضامین لکھنا شروع کیا۔ ۲۲-۲۳ نمبروں کی اشاعت کے بعد طوالت کے خیال سے اسے موقوف کر دیا مگر الجہاد فی الاسلام کے نام سے کوئی پانچ سو صفحے کی ایک مبسوط کتاب لکھی۔ اس میں احکام جہاد کی تفصیل و توضیح کے علاوہ دوسرے مذاہب (مثلاً مسیحیت اور ہندومت) کے قوانین جنگ کا اسلامی طریق کار سے موازنہ بھی کیا۔

قیام حیدرآباد

الجہاد فی الاسلام نے پہلی مرتبہ مولانا کو علمی دنیا میں روشناس کیا لیکن ان دنوں الجمعیۃ کی مالی حالت خراب تھی مولانا کو اس سے ترک تعلق کرنا پڑا۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں وہ جمعیۃ العلمائے ہند سے علیحدہ ہو گئے اور دہلی چھوڑ کر حیدرآباد میں اقامت اختیار کی۔ وہاں ان کے بھائی سید ابوالخیر مودودی دارالترجمہ سے وابستہ تھے۔ مولانا نے بھی اسی زمانے میں کسی پبلشر کے لئے تاریخ حکومتِ آصفیہ لکھی جو شائع ہو چکی ہے لیکن قیام حیدرآباد میں ان کا اہم کام ترجمان القرآن کی ادارت تھا جو ۱۹۳۲ء میں جاری ہوا۔ شروع میں یہ رسالہ مولوی ابو محمد مصلح (صاحب عالمگیر تحریک قرآنی) کا ترجمان تھا لیکن آہستہ آہستہ مولانا نے اس میں بڑی وسعت پیدا کی اور اسے ایک امتیازی شان دیدی۔

مولانا مودودی کی ایک قلمی تصویر

مولنا مودودی کوئی آٹھ نو برس حیدرآباد میں مقیم رہے۔ ان کے قیام حیدرآباد کے آخری ایام کی قلمی تصویر مولوی رئیس احمد جعفری کی کتاب "دید و شنید" میں ملتی ہے فرماتے ہیں:۔

مولانا مودودی ابوالاعلیٰ

آغاز میں ہم کیا تھے انجام میں ہم کیا ہیں

۱۹۳۳ء کی ایک سرد شام کو خلافت ہاؤس کے مہمانخانے میں ایک نئی صورت نظر آئی۔ میانہ قد، دوہرا بدن، سر پر ترکی ٹوپی، علیگڑھ کٹ پاجامہ، حیدرآبادی وضع کی شیروانی۔ ڈاڑھی ندارد غالباً مونچھیں بھی منڈی ہوئیں، انگریزی تراش کے بال، خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، کچھ خاموش خاموش کچھ الگ تھلگ سے، میں نے مولانا عرفان سے پوچھا۔ آپ کی تعریف؟ فرمایا ابوالاعلیٰ مودودی۔

اس نام کا مسمّیٰ آنکھوں کے لئے نیا تھا لیکن کانوں کے لئے نیا نہ تھا۔ بچپن سے مولانا ابوالاعلیٰ کے افکارِ دماغی، زود قلم و متوازن رائے کا سکہ دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہی صحافی تھا جس نے اپنی نوجوانی کے زمانہ میں جمعیۃ العلمائے ہند کے ترجمان "الجمعیۃ" کی عنانِ ادارت ہاتھ میں لی اور اسے ہندوستان کے بلند پایہ اخبارات کی صفِ اول میں پہنچا دیا۔ سوامی شردھانند کے حادثۂ قتل کے بعد جس نے "اسلام اور تشدد کا مسلک" کے موضوع پر اس قدر عالمانہ، مدلل اور بلند پایہ مقالات لکھے کہ دھوم مچ گئی۔ مخالفین تک داد دینے پر مجبور ہو گئے اور اب عرصے سے جس کی ادارت میں حیدرآباد سے رسالہ "ترجمان القرآن" نکل رہا تھا جس کے مقالات اپنے وزن اور معلومات کے اعتبار سے ہندوستان کے بڑے بڑے اربابِ نظر اور اہل علم کے لئے باعثِ فخر و رشک تھے۔ باتیں کیں تو معلوم ہوا خدا نے ذہانت کے ساتھ ساتھ علم، گہرائی اور فکر کی نعمت بھی عطا کی ہے۔ ابھی تک مولانا بڑے آدمی نہیں بنے تھے۔ دنیا سے بے نیاز بھی نہیں ہوئے تھے۔ ساحل بمبئی پر حیدرآباد کے ایک حاکم با اختیار تک جو ولایت سے آ رہا تھا اپنے ایک عزیز کی سفارش پہنچانے تشریف لائے تھے لیکن باتوں میں، لب و لہجہ میں بڑا پن پوری شان کے ساتھ موجود تھا۔ بے موقع تبسم سے گریز، مختصر اور دو ٹوک باتیں

قلا ملا سے پرہیز، تخلیہ اور تجلیہ میں یکساں سنجیدگی اور خاموشی۔ بڑے آدمیوں کے یہی اسلحہ ہوتے ہیں اور مولانا ان سے پورے طور پر مسلح تھے۔"

مولانا کے لئے یہ زمانہ ایک عمیق ذہنی کشمکش کا دور تھا ایک تو وہ ان دنوں ویسے ہی "پراگندہ روزی پراگندہ دل" رہتے تھے۔ لیکن تحریک خلافت کی ناکامی بھی ان کے لئے ذہنی کشمکش کا سامان پیدا کر چکی تھی۔ اس تحریک کی بدولت علماء کی قوت اور اہمیت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ جمعیۃ العلمائے ہند کی تشکیل بھی انہی دنوں ہوئی لیکن اس تحریک کی ناکامی اور ہندوستان کے اندرونی مسائل کی روز افزوں اہمیت سے پھر وہ طبقہ برسر اقتدار آگیا جس نے سرسید کے وقت سے اپنی مساعی مسلمانان ہند کے حقوق و مستقبل کے لئے وقف کر رکھی تھیں اور جس طبقے میں علماء کو نمایاں جگہ حاصل نہ تھی۔ مولانا ان نامساعد حالات کی بنا پر سخت پریشانی کی حالت میں تھے کہ جانب شمال سے روشنی کی شعاع نمودار ہوئی جو مولانا کے لئے شب تاریک کے بعد صبح صادق کا پیغام لیکر آئی۔ اس زمانہ میں مولوی نیاز علی صاحب نے پٹھانکوٹ کے قریب دار الاسلام قائم کیا اور جن حضرات کو وہاں کام کرنے کی دعوت دی ان میں مولانا مودودی بھی تھے۔

اسلامی جماعت کا آغاز

۱۹۳۸ء کی ابتدا تھی کہ مولانا مودودی حیدرآباد دکن سے پٹھانکوٹ تشریف لائے اور یہاں کام کا آغاز کیا۔ مگر ان کے اور مولوی نیاز علی صاحب کے درمیان کچھ اختلافات پیدا ہوئے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے لئے مولانا لاہور تشریف لے گئے۔ وہاں ۱۹۳۹ء میں تقریباً ایک سال تک اسلامیہ کالج لاہور میں صیغۂ دینیات کے ناظم رہے لیکن پھر پٹھانکوٹ تشریف لے گئے جو قیام پاکستان سے پہلے اسلامی جماعت کا مرکز تھا۔ اسلامی جماعت کی بنیاد ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں رکھی گئی پہلے جلسے میں کل پچھتر علماء اور ہمدرد شامل ہوئے اور مولانا مودودی امیر جماعت منتخب ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی اجلاس کے بعد ہی جماعت میں اختلافات رونما ہوگئے اور ذیل کے چار اصحاب نے مولانا مودودی کی ذات اور کام پر تحریری اعتراضات کئے اور پھر جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔

۱۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان بریلی۔
۲۔ مولانا سید محمد جعفر صاحب خطیب مسجد جامع کپور تھلہ۔
۳۔ قمر الدین خان صاحب سابق ناظم جماعت۔
۴۔ عطاء اللہ صاحب میتوا کھالی بنگال۔

لیکن ان حضرات کی علیحدگی سے جماعت کا کام کا نہیں بلکہ روز بروز ترقی کرتا گیا۔ ۱۹۴۳ء میں مولانا امین احسن اصلاحی جماعت میں شامل ہوئے۔ اس سال ارکان کی تعداد سات سو پچاس تک پہنچ گئی تھی لیکن اس میں کاٹ چھانٹ ہوئی اور جو ارکان غیر معمولی جذبہ جوش و خروش سے عاری تھے وہ رکنیت سے محروم اور جماعت سے باہر کئے گئے ارکان کی مجموعی تعداد چار سو پچاس سے بھی کم ہو گئی لیکن مخلص اور محنتی اراکین کی مدد سے اور مولانا مودودی کی قابلانہ قیادت کے زیر اثر جماعت میں اضافہ ہوتا گیا۔ بالآخر ۱۹۴۷ء میں اسلامی جماعت نے محسوس کیا کہ پٹھان کوٹ سے زیادہ مرکزی مقام پر اسلامی جماعت کا مرکز ہونا چاہیئے۔ چنانچہ جالندھر کے قریب بستی میں کام کا آغاز ہوا لیکن یہ سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور جماعت کو اگست ۱۹۴۷ء کے آخر میں پاکستان میں پناہ لینی پڑی۔

جماعت اسلامی نے تھوڑے سے عرصے میں فقط پراپگنڈا کے زور پر جو ترقی کی اور لوگوں میں رسوخ پیدا کیا وہ قابل داد ہے۔ بلاشبہ لیگ کا اثر اس سے کہیں زیادہ تھا اور ہے لیکن لیگ چالیس سال سے میدان میں ہے محسن الملک وقار الملک مولانا محمد علی، علامہ اقبال، قائد اعظم جیسی ہستیوں کے ہاتھوں میں پلی، پروان چڑھی۔ قیام پاکستان سے پہلے مسلمانوں کے حقوق کے لئے لڑنے والی یہی ایک جماعت تھی۔ اس نے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتیں دلوائیں، کونسلوں میں انکی شرکت

کا حق قائم کیا۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنوایا۔ سرحد کی اصلاحات کے لئے جدوجہد کی اور انجام کار مسلمانوں کو پاکستان دلایا۔ ان کارناموں کو دیکھ کر لوگ اس کے قائل ہوں تو چنداں محلِ حیرت نہیں لیکن اسلامی جماعت کے عملی کارنامے بہت مختصر ہیں۔ فقط اس کی دعوت کی دلآویزی اور منتظمین کی کارکردگی و اخلاص نے اسے موجودہ مقام پہ پہنچا دیا۔

مولانا مودودی کا ابتدائی مسلک

لیکن جہاں جماعت اسلامی نے حیرت انگیز ترقی کی، وہاں امیر جماعت مولانا مودودی میں ایک طرح کا ذہنی جمود بلکہ تنزل رونما ہوا۔ جماعت کے قیام سے پہلے ان کا بطور ایک مفکر اور متکلم کے خاص مقام تھا اور ایک خاص اندازِ فکر تھا۔ علماء کے جمود سے انہیں اسی طرح تنفر اور وحشت تھی جس طرح بعض تعلیم یافتہ لوگوں کی بے راہ روی دیکھ کر۔ ۱۹۳۶ء میں مولانا مودودی کا دعویٰ تھا کہ ہماری تحریک ارتجاعی (REACTIONARY) نہیں آگے چلنے والی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہماری نسبت یہ خیال نہ کیا جائے کہ دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے ہم اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہشمند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔[1] ان کا قول تھا "اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈراما بنائے رکھیں۔ وہ ہم کو قالب نہیں بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں ان سب میں یہی روح بھرتے جائیں۔[2]" مغربی علوم و فنون کی نسبت بھی انہوں نے اس سے پیشتر فرمایا تھا "مغربی علوم و فنون بجائے خود سب کے سب مفید ہیں اور اسلام کو ان میں سے کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔ بلکہ ایجاباً میں یہ کہوں گا کہ جہاں تک حقائقِ علمیہ کا تعلق ہے اسلام ان کا دوست ہے اور وہ اسلام کے دوست ہیں۔[3]"

اپنے طریقِ کار کی نسبت انہوں نے ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا:۔

"مجھے گروہ علماء میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے میں ایک بیچ کی راس کا آدمی ہوں جس نے جدید و قدیم دونوں طریقہائے تعلیم سے کچھ کچھ حصہ پایا ہے اور دونوں کو چل پھر کر دیکھا ہے۔ اپنی بصیرت کی بنا پر نہ تو قدیم گروہ کو سرمایۂ خیر سمجھتا ہوں اور نہ جدید گروہ کو۔" (ترجمان القرآن ص۲۲ ربیع الاوّل ۱۳۵۴ھ)

انہیں اس امر کا احساس تھا کہ مسلمانانِ ترکی کو مذہب سے برگشتہ کرنے میں علماء کی قدامت پسندی کو بڑا دخل تھا۔ تنقیحات میں فرماتے ہیں:-

"ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی۔ دوسری طرف ترکوں کے علماء و مشائخ نے جو اب بھی ساتویں صدی کی فضا سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے ان کے جمود، ان کی تاریک خیالی، ان کی رجعت پسندی اور زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے سے ان کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا۔ وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ..... وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کئے جائیں گے جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوئے ہیں۔" (تنقیحات ص۱۲)

ترکی میں علماء اور نوجوان ترکوں کے درمیان جو کشمکش پیدا ہوئی اس کے متعلق مولانا مودودی کا فیصلہ تھا:-

"پرانے مذہبی خیال کے لوگ نوجوان ترکوں پر کفر و فسق کے فتوے لگاتے ہیں مگر ان کو خبر نہیں کہ نوجوان ترکوں سے زیادہ گنہگار تو ترکی کے علماء اور مشائخ ہیں۔" (تنقیحات ص۳۳)

مولانا مودودی نہیں چاہتے تھے کہ برِّ اعظم کے علماء وہی غلطی کریں جو ترکی کے علماء نے کی تھی۔ وہ ترجمان القرآن میں ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:-

"میں اس بات کا بھی سخت مخالف ہوں کہ علماء کرام وقت کے رجحانات سے منہ موڑ کر بیٹھ جائیں اور اس امر کو بھول جائیں کہ وہ ہدایہ اور بدائع کے زمانۂ تصنیف میں نہیں بلکہ نت نئی سائنٹفک ایجادات اور تیز رفتار تمدنی انقلابات کے دور میں رہتے ہیں۔ اس دور میں روز نئے مسائل کا پیدا ہونا لابدی ہے اور ان مسائل کو ہدایہ

[1] ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۴ء [2] ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۶ء
[3] ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۳۶ء

وملکم کی روشنی میں حل کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں جس کا خطرہ
نوجوان سائل نے اپنے استفسار میں ظاہر کیا ہے۔ رہنمائی کے لئے
علماء اسلام میں وسعتِ نظر اور روحِ اجتہاد کی ضرورت ہے۔
قدم قدم پر عالمگیری اور تاتارخانی کو لاکر سدِ راہ بنانے کا لازمی
نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے زمانہ کا مسلمان قرآن و حدیث کو پیچھے چھوڑ کر
بدھر منہ اٹھے گا چل نکلے گا جس طرح ترک اور ایرانی چل نکلے۔"
(ترجمان القرآن اگست ۳۸ء)

مولانا مودودی علماء کے ہاتھ میں قوم کی زمام امامت دیکھنا
چاہتے تھے لیکن انہیں اس کا احساس تھا کہ یہ مقصد اسی صورت میں
حاصل ہو سکتا ہے کہ علماء اپنے نقطۂ نظر میں وسعت و تبدیلی پیدا
کریں۔ مولانا ترجمان القرآن میں فرماتے ہیں:-

"امامت خواہ وہ آگ کی طرف لے جانے والی ہو یا جنت
کی طرف، بہرحال اس گروہ کا حصہ ہے جو سمع و بصر و فواد کو تمام
انسانی گروہوں سے بڑھ کر استعمال کرے۔ یہ انسان کے حق میں اللہ
کا بنایا ہوا اٹل ضابطہ ہے اور اس میں کوئی رورعایت نہیں ہے خواہ
کوئی گروہ خدا شناس ہو یا خدا ناشناس۔ بہرحال جو بھی یہ شرط پوری
کریگا دنیا کا امام بن جائیگا اور جو نہ کریگا تو مقتدی ہی نہیں بلکہ
اکثر حالات میں [illegible] بھیڑ بننے سے نہ بچ سکیگا۔ آپ کو جس چیز نے
امامت کے منصب سے ہٹایا اور خدا ناشناس اہلِ مغرب کو اٹھایا
وہ دراصل یہی ضابطہ تھا۔ آپ کے ہاں مدت ہائے دراز سے علم کی
جو حالت تھی اس میں بصر اور فواد دونوں معطل تھے اور سمع کا کام
بھی صرف پہلے کی حاصل شدہ معلومات فراہم کرنے تک محدود
تھا بخلاف اس کے ناخدا شناس یورپ علم کے میدان میں آگے بڑھا
اور امام بن گیا اور آپ مقتدی بن کر رہ گئے۔ آپ کی دینی تعلیم
کے تمام مراکز ابھی تک اپنی اسی غلطی پر اڑے ہوئے ہیں جس نے
آپ کو اس درجہ پر پہنچایا ہے۔"

قرآن و سنت کے بھی جن اصولوں پر وہ تعلیم دینا چاہتے
تھے وہ قدیم کی نسبت جدید سے زیادہ قریب تھے۔ تنقیحات
میں فرماتے ہیں:-

"علوم اسلامیہ کو بھی ان کی قدیم کتابوں سے جوں کا توں
نہ لیجئے بلکہ ان میں سے متاخرین کی آمیزشوں کو الگ کر کے اسلام
کے دائمی اصول اور حقیقی اعتقادات اور غیر متبدل قوانین لیجئے۔
..... قرآن اور سنت کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث
کے پرانے ذخیروں سے نہیں۔" (ص [illegible])

اور تو اور کتبِ حدیث کے متعلق انہوں نے ایسے خیالات
کا اظہار کیا کہ اگر آج کسی اور کے قلم سے ان کا بیان ہو تو اسے منکرین
حدیث میں سے شمار کیا جائے۔ تفہیمات میں فرماتے ہیں:-

"محدثین نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا
ہے جو بلاشبہ بیش قیمت ہے مگر ان میں ایسی کونسی چیز ہے جس میں غلطی
کا احتمال نہ ہو۔" (ص ۲۹۲)

تفسیر کے متعلق بھی ان کا طریق کار قدیم کی نسبت جدید کے
زیادہ مناسب تھا۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں پرانے مفسرین سے
استفادہ نہیں کیا۔ اپنے تاثرات کو لکھا ہے۔ خود تفسیر کی ابتدا
میں فرماتے ہیں:-

"اس میں جس چیز کی کوشش میں نے کی ہے وہ یہ ہے۔ کہ
قرآن کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آئے اور جو اثر میرے قلب
پر پڑتا ہے اسے جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کر دوں۔"

علم تفسیر کے متعلق تنقیحات میں آپ نے فرمایا تھا کہ قرآن
کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر کافی
ہے۔" (ص ۲۲۲)

جدید متکلمین کا خیال ہے کہ قدماء نے عبادات اور اعتقادات
پر زیادہ زور دیا تھا اور اعمال اور خدمتِ خلق پر کم حالانکہ کلام مجید
کا نقطۂ نظر اس معاملے میں کچھ اور ہے۔ مولانا مودودی کی قدیم
تصانیف سے خیال ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بھی ان کا نقطۂ نظر
جدید سے قریب تر تھا۔ خطبات (حصہ سوم) میں فرماتے ہیں:-

"آپ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ باندھ کر قبلہ رو کھڑے ہونا،
گھٹنوں پر ہاتھ ٹیکنا، زمین پر ہاتھ ٹیک کر سجدہ کرنا اور چند
مقررہ الفاظ زبان سے ادا کرنا، بس یہی چند افعال اور حرکات

بجائے خود عبادت ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ رمضان کی پہلی تاریخ سے شوال کا چاند نکلنے تک روزانہ صبح سے شام تک بھوکے پیاسے رہنے کا نام عبادت ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے چند رکوع زبان سے پڑھ دینے کا نام عبادت ہے۔ غرض آپ نے چند افعال کی ظاہری شکلوں کا نام عبادت رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جس عبادت کے لئے آپ کو پیدا کیا ہے اور جس کا آپ کو حکم دیا ہے وہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ وہ عبادت یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی میں ہر وقت، ہر حال میں خدا کے قانون کی اطاعت کریں اور ہر اس قانون کی پابندی سے آزاد ہو جائیں جو قانونِ الٰہی کے خلاف ہو۔" (خطبات حصہ سوم ص ۱)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

"آپ پوچھیں گے کہ پھر نماز، روزہ اور حج وغیرہ کیا چیزیں ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل یہ عبادتیں جو اللہ نے آپ پر فرض کی ہیں ان کا مقصد اس بڑی عبادت کے لئے تیار کرنا ہے جو آپ کو زندگی میں ہر وقت ہر حال میں ادا کرنی چاہیئے۔" (خطبات حصہ سوم ص ۱۲)

اسلامی شریعت کی عام ترجمانی کی نسبت وہ فرماتے ہیں :-

"دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کی بجائے عہد گذشتہ کی تاریخ بن کر رہ گیا ہے۔" (ترجمان القرآن جلد ۱۸ عدد ۱)

آگے چل کر فرمایا ہے: "اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثارِ قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔"

اور آگے ملاحظہ فرمایئے :-

"تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر منصوص تعین اور رُوح سے بڑھ کر ظاہر پر مدار دینداری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے۔ وہ غیروں کی تالیف تو کیا کرے گی اُلٹے اپنوں کی تنفیر کا سبب بن رہی ہے۔"

مولانا مودودی کے خیالات میں انقلاب

۱۹۳۸-۳۹ء کے بعد مولانا کے خیالات

میں ایسا انقلابِ عظیم آیا کہ پھر انہوں نے اسلام کی جس صورت پر نعرہ دیا اس میں "روح" نہ تھی صرف "قالب" ہی "قالب" تھا۔ اب جس تمدن کو وہ رواج دینا چاہتے تھے وہ وہی تھا "جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا" اور مغربی علوم و فنون کے لئے کلمۂ خیر توان کی تازہ تصنیفوں اور تقریروں میں ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ خود مولانا کو بھی خدشہ تھا کہ جماعتی پابندیوں کے باعث کہیں ان کی مفکرانہ و متکلمانہ حیثیت پر آنچ نہ آجائے۔ چنانچہ انہوں نے جماعت کے پہلے جلسے میں فرمایا:-

"فقہ اور کلام کے مسائل میں میرا ایک خاص مسلک ہے جس کو میں نے اپنی ذاتی تحقیق کی بنا پر اختیار کیا ہے اور پچھلے آٹھ سال کے دوران میں جو اصحاب "ترجمان القرآن" کا مطالعہ کرتے رہے ہیں وہ اس کو جانتے ہیں لہٰذا میری حیثیت اس جماعت کے امیر کی ہوگی۔ میرے لئے یہ بات صاف کر دینی ضروری ہے کہ فقہ و کلام کے مسائل میں جو کچھ میں نے پہلے لکھا ہے اور جو کچھ آئندہ لکھوں گا یا کہوں گا اس کی حیثیت امیر جماعت اسلامی کے فیصلہ کی نہ ہوگی بلکہ میری ذاتی رائے کی ہوگی۔ میں نہ تو یہ چاہتا ہوں کہ ان مسائل میں اپنی رائے کو جماعت کے دوسرے اہلِ علم و تحقیق پر مسلط کروں۔ اور نہ اس کو پسند کرتا ہوں کہ جماعت کی طرف سے مجھ پر ایسی کوئی پابندی عائد ہو کہ مجھ سے علمی تحقیق اور اظہارِ رائے کی آزادی سلب ہو جائے۔"

مولانا کی علمی تحقیق اور آزادیٔ رائے پر جماعت نے کوئی پابندی نہ لگائی لیکن اب وہ جس ماحول میں رہنے لگے اور جو جماعتی نصب العین انہوں نے سامنے رکھا اس کا غیر محسوس اثر ان کے خیالات پر ناگزیر تھا۔ مولانا کے رفقائے کار بڑے محنتی، مخلص اور پُرجوش ہیں لیکن ذہنی اعتبار سے ان میں سے ایک بھی مولانا کی ٹکر کا نہیں۔ اور نہ صرف وہ علمی اور ذہنی حیثیت سے

مولانا کی سطح سے بہت نیچے ہیں بلکہ انہیں تو ان مسائل کا سرے سے احساس ہی نہیں جن کا حل اس زمانے میں ضروری ہے۔ مسائلِ حاضرہ اور قدیم و جدید کے توازن کی نسبت کبھی بھی ان کا وہ نقطۂ نظر نہ تھا جو ۳۷-۱۹۳۶ء سے پہلے مولانا کا تھا۔ اس کے علاوہ انتہاپسندی، ضد اور تحقیرِ مخالفین میں وہ مولانا سے بہت آگے ہیں[۵]۔

ان حضرات کے اثرِ صحبت کے علاوہ جماعتی نصب العین کا شعوری اور غیر شعوری اثر بھی مولانا پر ہوا اور شاید اس اتفاق نے کہ جماعت کی تشکیل کی مخالفت فقط علماء کی طرف سے ہوئی۔ جماعت کو علماء کے زاویۂ نگاہ کے متعلق زیادہ محتاط کر دیا۔ ان سب اسباب (یا کسی اندرونی ذہنی انقلاب) نے مولانا کے خیالات پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ اپنے ابتدائی نقطۂ نظر سے ہٹ کر کہیں سے کہیں جا پہنچے۔

مولانا کے خیالات میں جو تغیر و تبدل ہوا اور جو طریق کار انہوں نے بالآخر اختیار کیا اس نے ان کے خیالات کی عام مقبولیت میں بڑی مدد دی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کوئی مفکر گوشۂ غور و فکر سے نکل کر جماعتی تنظیم کی منزل میں قدم رکھتا ہے تو اسے اس طرح کا تغیر و تبدل گوارا کرنا ہی پڑتا ہے لیکن راقم السطور اور مولانا کے علم و فضل کے بعض مداحوں کا خیال ہے کہ نہ صرف اصولی اور قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے مولانا کا ابتدائی مسلک زیادہ صحیح تھا، بلکہ پاکستان (اور جدید ہندوستان) کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ جماعتی نقطۂ نظر سے بھی (اگر اسلامی جماعت کو حزبِ مخالف کی حیثیت سے آگے بڑھنا ہے) وہی مسلک زیادہ مفید رہتا[۶]۔

مولانا کے سیاسی معتقدات

مولانا مودودی کو شروع سے سیاسیات سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ ان کی زندگی کا آغاز بطور جرنلسٹ ہوا جمعیۃ العلماء ہند جس کے دامن سے وہ وابستہ ہوتے بظاہر نیم مذہبی نیم سیاسی مگر اصل میں پورا سیاسی ادارہ تھا۔ حیدرآباد میں مذہبی رنگ ان پر زیادہ چڑھا، لیکن سیاسی خیالات اور عزائم فراموش نہ

---

[۵] مولانا عبدالماجد دریابادی کے اخبار صدق جدید (۱۶ نومبر ۱۹۵۸ء) میں مولانا مودودی کی نسبت "ان کے ایک پاکستانی مخلص" کا مراسلہ شائع ہوا تھا جو اگر مولوی نیاز علی بانی دارالاسلام پٹھانکوٹ کا نہیں تو (دارالاسلام کے) کسی ایسے بزرگ کی تحریر ہے جنہیں پنجاب میں مولانا مودودی سے "تعلقات کی اولیت" حاصل ہے اور جن کے مولانا مودودی کے ساتھ (دارالاسلام میں طویل قیام کے باعث) "خانگی تعلقات ہیں۔" وہ مولانا مودودی کی نسبت لکھتے ہیں: "ان کی تحریک کا اس ملک کی اصلاح میں خیر کا پہلو بہت زیادہ ہے یعنی لوگوں کو اس سے بہت فائدہ ہوا۔ ہاں ان کے طریق کار اور خاص قلبی کیفیت (نفرت اور حقارت) نے ان کو یعنی ان کی تحریک کو بہت نقصان پہنچایا ۔ ۔ ۔ زیادہ خرابی تو مولانا کے بعض رفقاء نعیم صدیقی اور نصر اللہ خاں عزیز صاحب کے قلم کی زہر چکانی نے پھیلائی ہے۔ اصلاحی صاحب کو بھی اپنے علم و فضل کا بہت زعم ہے اسلئے یہ لوگ ہر قسم کی ٹھوکر لینے کو تیار ہیں۔" (ص۸)

[۶] مولانا کے خیالات میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کی ایک دلچسپ مثال مسئلہ تصویر کشی کے متعلق ملتی ہے۔ مولانا نے دسمبر ۱۹۳۲ء کے ترجمان القرآن میں لکھا تھا: "سینما ناپاک نہیں ہے۔ ناپاک دراصل وہ تہذیب ہے جو غضب کی پیدا کی ہوئی اس طاقت سے فحش اور بے حیائی کی اشاعت کا کام لیتی ہے" یعنی اگر سینما سے فحش اور بے حیائی کی اشاعت کا کام نہ لیا جائے تو سینما کی چلتی پھرتی تصویریں قابلِ اعتراض نہیں لیکن اب عام تصویروں کے متعلق بھی جماعت کا جو نظریہ ہے اسے مولانا مسعود عالم کے الفاظ میں پڑھیے جو علمائے عرب سے اپنی بحثوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "داڑھی کی حد تک تو یہاں معقول لوگ سمجھتے ہیں یہ سنت اور شعار ہے اور اس کا رکھنا اچھا ہے لیکن فوٹو کی حرمت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ سید رشید رضا اور محمد عبدہ کے بعد ہمارے جیسے طالب علموں کی بات کیوں سنیں گے۔ بہرحال یہاں لوگ کچھ بھی سمجھیں ان کی خاطر یا ملائیت کے الزام کے خوف سے ہم اپنا مسلک بدلنے کے نہیں۔" (دیارِ عرب میں ص۳۸) ——— خود مولانا مودودی ترجمان القرآن بابت رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ میں فرماتے ہیں: "فوٹو گرافی اور مصوری میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اور ممانعت چونکہ جاندار اشیاء کی ہے اسلئے تمام تصویریں حرام ہی ہونگی۔ خواہ وہ فحش ہوں یا غیر فحش۔"

ہوئے۔ شروع میں ترجمان القرآن میں زیادہ تر فکری اور مذہبی مضامین شائع ہوتے تھے لیکن ۱۹۳۷ء میں انہوں نے اس میں اسلامی ہندوستان کے متعلق چند سیاسی مضامین لکھے جو بعد میں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول کے عنوان سے مدون ہوئے۔ مولانا نے اس کے بعد ان پر مختلف موقعوں پر تین مختلف رسالے لکھے اور چونکہ ان تینوں رسالوں کے موضوع ایک حد تک مختلف ہیں اسلئے ہم ان کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیتے ہیں۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (حصہ اول)

حصہ اول ابتدائی

مضامین کا مجموعہ ہے اور اس میں اُن سیاسی خیالات کا اظہار ہے جو مولانا کے دماغ میں ہیولے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس حصہ میں مولانا کے نقطۂ نظر کا عمومی اور مختصر سا اظہار ہے۔ اس وقت ان کا مطمح نظر حسب ذیل تھا:۔

"ہمیں اس امر کی کوشش کرنی چاہیئے کہ جمہور مسلمانوں کی زیادت کا منصب نہ انگریز کے غلاموں کو حاصل ہو سکے نہ ہندو کے غلاموں کو بلکہ ایک ایسی جماعت کے قبضے میں آجائے جو ہندوستان کی کامل آزادی کے لئے دوسری ہمسایہ قوموں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر دل سے آمادہ ہو مگر اسلامی مفاد کو کسی حال میں قربان کرنے پر آمادہ نہ ہو" (صفحہ ۴۲)

(حصہ دوم): "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا پہلا حصہ ایک مختصر سا رسالہ تھا۔ تقریباً دو سال بعد مولانا نے اس سے کوئی دگنی ضخامت کا دوسرا رسالہ لکھا جو پہلی دفعہ دسمبر ۱۹۳۹ء میں شائع ہؤا۔ جب سیاسی کشمکش کا پہلا حصہ چھپ کر نکلا تو اسوقت مسلم لیگ جسد بے جان تھی اور قائد اعظم اس میں جان ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مولانا کی نظر میں وہ بے حیثیت تھی اسلئے انہوں نے اس پر توجہ نہ فرمائی اور نہ اس کا خاص طور پر ذکر کیا۔ دوسرے حصہ میں بھی ان کا زور قلم زیادہ تر کانگریس پر صرف ہؤا لیکن اس حصے میں (مسلم لیگ کا نام لئے بغیر) اس کی قیادت پر وہی الزام تراشے اور لگائے گئے جو جمعیۃ العلمائے ہند اور کانگریسی مسلمانوں کا مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں کی مخالفت میں عام حربے تھے۔ اس حصے کے آخر میں مولانا فرماتے ہیں:۔

"مسلمان انتہا درجہ کے نادان ہوں گے اگر وہ اب بھی حالات کی نزاکت کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھیں گے۔ وہ ابھی تک اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ ان کو یہ نمائشی جلسے اور جلوس اور کھوکھلے مظاہرے قومی ہلاکت سے بچا لیں گے۔ وہ ان لوگوں کی لیڈری پر اعتماد کئے ہوئے ہیں جن کے سامنے اپنی وزارت اور وجاہت کے سوا کوئی چیز نہیں۔ جو اپنی قوم کے لئے اپنا بال بیکا ہونا گوارا نہیں کر سکتے۔ جو مسلمانوں کے مفاد کا نام صرف اسلئے بلند آہنگیوں کے ساتھ لیتے ہیں کہ ایوان وزارت پر ان کا قبضہ رہے جن کی بزدلی پر دشمنوں کو پورا پورا اعتماد ہے جنہیں چیلنج کیا جاتا ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھ جیل میں جانے اور لاٹھیاں کھانے کو تیار ہو تو ہم تمہاری ہر بات ماننے کے لئے تیار ہیں۔ اور وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کی بجائے کنی کاٹ جاتے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ یورپ میں سرکار برطانیہ کو جنگ کا خطرہ پیش آتا ہے تو یہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اپنی وفادارانہ خدمات پیش کرتے ہیں۔ ایسے لیڈروں سے اگر مسلمان یہ توقع باندھے بیٹھے ہیں کہ وہ اُن کی کشتی بھنور سے نکال لیں گے تو میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ان کی کشتی ڈوب کر رہے گی" (صفحہ ۲۱۵-۲۱۶)

جہاں تک آئندہ آئین کا تعلق تھا مولانا مودودی نے اپنا نصب العین حاصل کرنے کے لئے تین مختلف خاکے پیش کئے۔ ان کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ جس پر لیگ کا قائد پہنچا وہ اس سے کوسوں دور ہے۔ مسلمانوں کی علیحدہ حکومت کا خیال انہیں خواب میں بھی نظر نہ آیا۔ فیڈریشن کی مختلف صورتوں پر قانع رہے۔ پہلے خاکے میں تہذیبی خود اختیاری (CULTURAL AUTONOMY) پر زور رکھا اور جن چیزوں کے تحفظ کے مولانا خواہاں تھے وہ حسب ذیل تھیں:۔

"تعلیم، مذہبی معاملات (مثلاً عبادت گاہوں اور اوقاف کا نظم و نسق اور مذہبی احکام اپنے اپنے افرادِ قوم پر نافذ کرنا اور

ان احکام کے خلاف ان کی سرکشی کو روکنا اور مخصوص تمدنی و معاشرتی مسائل، مثلاً نکاح، طلاق، وراثت اور قومی طرزِ معاشرت (NATIONAL SOCIAL SYSTEM) میں ہر قوم کو پوری خود اختیاری حاصل ہو اور مرکز کو اس میں دخل دینے کا حق نہ ہو۔" (صفحہ ۲۱)

(حصہ سوم) مولانا مودودی نے جب موجودہ سیاسی کشمکش کا پہلا اور دوسرا حصہ لکھا اس وقت ایک تو مسلم لیگ کی نئی تنظیم ابتدائی حالت میں تھی دوسرے مولانا (جن کا نقطۂ نظر مسلم لیگ اور مسلمانوں کی سیاسی قیادت کی نسبت ہمیشہ خاص قسم کا رہا ہے) اسے حقارت سے زیادہ کسی چیز کا مستحق نہ سمجھتے تھے۔ اسلئے ان دونوں حصوں میں لیگ کے متعلق ان کے تفصیلی اور واضح خیالات نہیں ملتے۔ لیکن عین اُس وقت جب مولانا یہ مضامین لکھ رہے تھے ایک مردِ مجاہد مصروفِ عمل تھا۔ اس نے مسلم لیگ میں ایک نئی زندگی پیدا کی اور قوم کو اسکے جھنڈے تلے اس طرح جمع کیا کہ وہ کسی ٹھوس اور نتیجہ خیز مقصد کے لئے اس سے پہلے کبھی جمع نہ ہوئی تھی۔ مولانا کو یہ صورتِ حالات بھی ناپسند تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس کے متعلق اپنے خیالات "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم کے عنوان سے ترتیب دیئے۔ یہ خیالات بعض امور میں پہلے دو حصوں کے اندراجات سے اس قدر مختلف تھے کہ مولانا نے مقدمہ میں ہی محسوس کیا کہ اس قلابازی کی وضاحت ضروری ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے میرے مضامین کے دو مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں اب اس سلسلہ کا یہ تیسرا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ بظاہر پہلے دو مجموعوں سے اس تیسرے مجموعہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں یوں محسوس کریگا کہ میں نے حصہ دوم کے بعد سے یکایک اپنی پوزیشن بدل دی ہے۔ اور خود اپنی بہت سی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگا ہوں لیکن دراصل ان تینوں مجموعوں میں ایک نصب العین کی طرف تدریجی ارتقاء ہے۔"

"پاکستانی خیال کے لوگ" تیسرے حصے کو اسلامی جماعت کا سیاسی منشور سمجھنا چاہیئے۔ اس وقت اسلامی جماعت قائم ہو چکی تھی چنانچہ اس کا دستور العمل کتاب کے آخر میں بطور منزل مقصود کے شامل ہے۔ کتاب میں مولانا نے جابجا مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور بالخصوص مسلم لیگ پر نکتہ چینی کی ہے۔ ایک مستقل باب کا عنوان تھا "پاکستانی خیال کے لوگ"۔ اس میں تحریک پاکستان اور لیگی قیادت پر طرح طرح کے اعتراضات تھے۔ مثلاً جو لوگ یہ کہتے تھے کہ "مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی اپنی ہی حکومت قائم ہو جائے پھر کوشش کی جائے گی کہ یہ قومی اسلامی نظام حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے"۔ مولانا ان کے جواب میں لکھتے ہیں :-

"ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حاکمیت جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخرکار حاکمیت رب العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے جیسی مسلم اکثریت اس مجوزہ پاکستان میں ہے ویسی ہی بلکہ عددی حیثیت سے بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان، ایران، ٹرکی اور مصر میں موجود ہے اور وہاں اس کو وہ پاکستان حاصل ہے جس کا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومت کسی درجہ میں بھی حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں مددگار رہی ہے یا ہوتی نظر آتی ہے مددگار ہونا تو درکنار میں پوچھتا ہوں کیا آپ وہاں حکومتِ الٰہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلا وطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں؟

"اگر آپ وہاں کے حالات سے کچھ بھی واقف ہیں تو آپ اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کر سکیں گے جب صورتِ معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش کرے جو کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اس کے مقصد کی راہ میں حائل ہو گی۔"
(صفحہ ۱۳۱-۱۳۳)

جماعت کو الیکشن ۱۹۴۵ء سے علیحدہ رہنے کی ہدایت

"مسلمان اور سیاسی کشمکش" میں جو سیاسی بحث مولانا نے کی وہ ایک حد تک نظری تھی لیکن ان مباحث نے جلد ہی شدید عملی صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۵ء کے آخر میں وہ انتخابات ہوئے جن کے نتائج پر اس برِاعظم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا اور یہ طے پانا تھا کہ برطانیہ اپنا اقتدار اکھنڈ بھارت کو سونپ جائے۔ یا یہ برِاعظم بھارت اور پاکستان میں منقسم ہو۔ اس موقع پر مسلمان یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ جماعتِ اسلامی کس فریق کا ساتھ دیتی ہے۔ لیگ والوں نے امیرِ جماعتِ اسلامی کی مدد حاصل کرنی چاہی لیکن انہیں قائل نہ کر سکے۔ تاہم امید تھی کہ وہ اپنے پیروؤں کو اس امر کی آزادی دیدینگے کہ وہ جس طرف چاہیں ووٹ دیں۔ اور خیال تھا کہ انکی اکثریت (کم از کم اسلامی اکثریت کے علاقوں میں) پاکستان کے حق میں ووٹ دیگی۔ لیکن مولانا نے بالکل نیا راستہ اختیار کیا۔ اور ایک سوال کے جواب میں (جو کہ ترجمان مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا) انتخابات میں شرکت اور ووٹ دینے کو یکسر حرام قرار دیا اور فرمایا:۔

"ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو بہرحال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ نا ممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔"

مولانا نے اپنے اس فیصلہ کی وجہ یہ بتائی کہ چونکہ موجودہ نظام "حاکمیتِ جمہور" پر قائم ہوتا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے۔ اسلئے ہم اس سے اشتراک نہیں کر سکتے۔ اس فیصلہ کی بنا پر مسلم لیگ اور پاکستان کے حامیوں کو تو مسلمانوں کے ووٹوں کا ضائع جانا ناگوار تھا ہی ترجمان القرآن میں بھی کسی صاحب نے ایک تفصیلی مضمون میں اس فیصلہ میں ترمیم کی ضرورت واضح کی اور کہا کہ اگر ممبرانِ اسمبلی کو قانون سازی کا غیر مشروط حق حاصل ہے تو اس حق کا غیر مشروط ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ یہ لوگ صحیح قانون مرتب کرنے میں آزاد ہیں۔ یعنی ان کو اختیار حاصل ہوگا کہ ایسا قانون مرتب کریں جس میں آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتابِ الٰہی کے تحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔"[1]

مضمون نگار نے اس اسلامی فضا کی طرف بھی اشارہ کیا جو مسلم لیگ نے پیدا کر دی تھی۔ اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اس سے "مذہبی قیادت" کے مدعی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس پر مولانا مودودی نے "موجودہ انتخابات اور جماعت اسلامی" کے عنوان سے "ترجمان القرآن" میں ایک طول طویل مضمون لکھا۔ اور ظاہر کیا کہ انتخابات سے علیحدگی کے دو اسباب ہیں۔ ایک وجہ تو اصولی ہے (جس کا اظہار اوپر ہو چکا ہے) دوسری عملی یعنی اس سے حصولِ مقصد کے لئے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

پاکستان کے خلاف مولانا کا پراپگنڈا

اس مضمون میں مولانا نے پاکستان اور مسلم لیگ کے متعلق بدترین بدگمانیوں کا اظہار کیا۔ پاکستان کی نسبت وہ فرماتے ہیں:۔

"جنت الحمقاء میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریک

---

[1] قائداعظم نے بھی پیر صاحب مانکی شریف کے نام ایک خط میں جو نومبر ۱۹۴۵ء میں لکھا گیا بالکل اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو مولانا شبیر احمد عثمانی کی وہ تقریر جو انہوں نے قراردادِ مقاصد پر مجلس آئین ساز میں کی تھی)

ہوں گے جس طرح مسلمان۔ اور پاکستان میں ان کی تعداد اتنی کم اور ان کی نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہوگی کہ شریعت اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنایا جاسکے۔[۱]"

تحریکِ پاکستان کو چلانے والی جماعت
مسلم لیگ کی نسبت مولانا کی رائے

حسب ذیل تھی:-

"مسلم لیگ کی تحریک کے متعلق پہلی بات تو یہ سمجھ لیجئے کہ اس کے بنیادی تصورات، اس کا نظام ترکیبی، اس کا مزاج اور اس کی اسپرٹ، اس کا طریق کار اور اس کے مقاصد سب کچھ وہی ہیں جو قومی اور قوم پرستانہ تحریکوں کے ہوا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مسلمانوں کی قومی تحریک ہے اور مسلمانوں کی ہر چیز "اسلامی" بن جایا کرتی ہے اسلئے خواہ مخواہ اسے بھی اسلامی تحریک سمجھ لیا گیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایک دوسری ہی چیز ہے جس کا کوئی شائبہ بھی مسلم لیگ کی قومی تحریک میں نہیں پایا جاتا۔ اور یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اسلام اپنے مخصوص طریق کار سے جس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے اس تک آپ ایک قوم پرستانہ تحریک کے ڈھنگ اختیار کرکے پہنچ جائیں۔ ہر منزل اپنی فطرت کے لحاظ سے اپنی ہی ایک مخصوص راہ رکھتی ہے۔ آپ اسلام کی منزل مقصود کو پہنچنا چاہیں تو آپ کو اسلامی تحریک ہی کی مخصوص راہ کو سمجھنا اور اسے اختیار کرنا پڑے گا۔ قوم پرستی کے طریقے اختیار کرکے آپ قومیت کی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر یہ توقع کرنا انتہائی پراگندہ خیالی ہے کہ ان ڈھنگوں سے آپ اسلامی منزلِ مقصود تک جا پہنچیں گے۔ اس نکتہ کی توضیح کا یہاں موقع نہیں ہے۔ میں "مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ سوم" میں تفصیل کے ساتھ یہ بتا چکا ہوں کہ ایک اصولی تحریک اور ایک قوم پرستانہ تحریک میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ضرورت ہو تو پھر اس کی تشریح کر سکتا ہوں۔ یہاں میں اشارۃً صرف اتنی بات واضح کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک اصولی تحریک کے کارکنوں کو یہ خبر دینا کہ تمہارے لئے ایک قوم پرستانہ تحریک نے بڑے اچھے مواقع پیدا کر دیئے ہیں کسی بصیرت اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں ہے۔ اس کی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے کسی عازم کلکتہ کو یہ خبر دی جائے کہ کراچی میل کھڑا ہے۔

ان کی یہ خوشخبری کسی حد تک اگر صحیح ہو بھی سکتی تھی تو شاید اس صورت میں ہوتی جب کہ مسلمانوں کی اس قوم پرستانہ تحریک میں کم از کم نانوی حیثیت ہی سے مذہب کا پورا زور اور اثر موجود ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں اس کا بھی فقدان ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ فی الواقع مسلمانوں کو اسلام اور اس کی تہذیب اور اس کے احکام کی اطاعت سے دور بہت دور تر لے جا رہی ہے۔[۲]"

یہ اظہار خیال فروری ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ اس کے کوئی سوا سال بعد ۲۷، ۲۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو یعنی قیام پاکستان سے کوئی چار مہینے پہلے ٹونک میں اسلامی جماعت کا ایک اہم جلسہ ہوا۔ اس میں بھی مولانا مودودی سے مسلم لیگ کے بارے میں سوال ہوئے جن کے جواب مولانا نے دیئے۔ یہ سوال اور جواب ترجمان القرآن جلد ۳۰ عدد ۱ میں درج ہیں۔

سوالات:- "(۱) یہ تسلیم ہے کہ مسلم لیگ کے پیش نظر جو پروگرام ہے وہ غیر اسلامی ہے لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت دین سے ناواقف ہے۔ علماء نے انہیں اسلام سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے سیاسی لیڈروں کے بتلائے ہوئے راستہ کو ہی صراط مستقیم اور اسلام کا صحیح راستہ سمجھ رہے ہیں اور غیر مسلم قومیں ان کے وجود کو مٹانے کے لئے سفاکی و خونریزی سے کام لے رہی ہیں۔ ان حالات میں ان کی مظلومی میں جماعت ان کا

[۱] ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۶ء صفحہ ۱۵۵-۱۵۲

[۲] ترجمان القرآن جلد ۲۸ عدد ۳ صفحہ ۱۵۹-۱۵۶

ساتھ کیوں نہ دے اور غیر مسلموں سے اس مدافعانہ جنگ میں شریک کیوں نہ ہو۔

(۲) اس وقت برطانیہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے سپرد کر رہا ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوؤں کا حصہ ہندوؤں کے حوالہ کیا جائے اور مسلمانوں کا حصہ مسلمانوں کے حوالہ کیا جائے۔ اور دوسری یہ کہ پورے ملک کی باگ ڈور اکثریت یعنی ہندوؤں کے حوالے کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ نے مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیا تو غیر مسلم اکثریت سارے ملک پر اور مسلمانوں پر مسلط ہو جائیگی"

امیر جماعت ——— "ان سوالوں کا واضح مطلب یہ ہے کہ موجودہ حالت میں مسلمانوں کی اس قومی تحریک کا ساتھ دیا جائے۔ اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں تو پھر ان کا ساتھ چھوڑ دیا جائے کیونکہ اسے تو سائل صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تحریک غیر اسلامی ہے۔ مگر میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ جس قسم کے حالات دیکھ کر وہ ہم سے اس وقت یہ مطالبہ کر رہے ہیں ایسے حالات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ مسائل پہ مسائل پیدا ہوتے جائیں گے اور ہر مسئلہ پہلے مسئلے سے شدید تر ہوگا اور آپ کہیں بھی لکیر نہیں کھینچ سکیں گے کہ فلاں حد تک تو ہم ان قومی تحریکوں کا ساتھ دیں گے اور وہاں پہنچ کر ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ یہ تو ہے اس سوال کا ایک رُخ، دوسرا رُخ جو اس سے کہیں زیادہ قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے جن مسائل اور مصائب کا اس قدر رونا رویا جا رہا ہے یہ مسائل اور مصائب سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اگر مسلمان اسلام کے فی الواقع سچے نمائندے ہوتے اور اگر مسلمان اب بھی سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی یہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقع خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے۔ اور اس میں ایک لادینی جمہوریت حکومت (SECULAR DEMOCRACY) یا عوامی پارلیمنٹری حکومت (POPULAR PARLIAMENTARY GOVT) نہیں بلکہ خالص خدا کی حکومت کتاب و سنت کے اصول پر قائم ہو سکتی ہے۔

اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی۔ اگر لوگ اسلام اور اسلامی طریق کار کو اپنی خواہشاتِ نفس کے خلاف پا کر ان کو ترک کر دینا چاہتے ہیں تو ہیر پھیر کے راستوں سے آنے کے بجائے صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ اللہ اور رسول کے کام کو چھوڑئیے اور ہمارے نفس کے کام میں حصہ لیجئے۔"

آخری فقروں کی بے دردی سے قطع نظر کیجئے اور یہ بات بھی نظر انداز کر دیجئے کہ مسلمانوں کی "قومی لڑائی" کو کس حد تک "نفس کے کام" کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس ایک فقرہ سے مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ "اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی"۔ مسلم لیگ کا خیال ہے کہ اسلام اور اسلامی قومیت ایک دوسرے کی ضد نہیں۔ دونوں کے تقاضے پورا کرنے کی کوشش ہو سکتی ہے۔ بلکہ یہ دونوں ایک تصویر کے دو پہلو ہیں۔ یا اگر ایک آبِ حیات ہے تو دوسری آبِ حیات سے بھری ہوئی صراحی۔

ٹونک کے جلسے کے کوئی ایک ہفتہ بعد مدراس میں جماعت اسلامی کا ایک اہم جلسہ ہوا۔ چونکہ اب مسلم لیگ اور جماعت کے اختلافات ڈھکے چھپے نہیں رہے تھے۔ لیگ کے بعض ذمہ دار حامیوں اور عام مسلمانوں نے جلسے میں خلل انداز ہونے کی کوشش کی اس پر لیگ کے ذمہ دار لیڈروں نے اظہارِ معذرت بھی کیا لیکن اس موقع پر مسلم لیگ کے ایک سربر آوردہ کارکن

ڈاکٹر نعمت اللہ صاحب نے ایک چٹ پر لکھ کر ایک سوال مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ آج جماعت اسلامی ہی نہیں بلکہ سارے پاکستان کے سامنے سب سے بڑا سوال ہے:

"کیا اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ایک وقت میں نہیں کی جاسکتی۔ اگر نہیں تو کیوں؟"[1]

پنجاب میں لیگ یونینسٹ کشمکش اور کوثر کا رویہ

اسلامی جماعت کے راہنما لیگ کو بیکار اور آرام طلب لوگوں کی جماعت کہتے تھے۔ جن کی "بزدلی" پر بقول مولانا مودودی "دشمنوں کو بھی پورا پورا اعتماد ہے"[2] جو جیل میں جانے اور لاٹھیاں کھانے سے ڈرتے تھے۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ جب پنجاب میں مسلم لیگ کے لیڈر "جیل جانے اور لاٹھیاں کھانے پر" تل گئے تو کوثر پھر بھی اس تحریک کے نکتہ چینوں میں پیش پیش تھا۔ گویا جو کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا۔

پنجاب مسلم لیگ کی تحریک سول نافرمانی کو پاکستان کے حصول میں جو اہمیت حاصل ہے اس سے سیاسی مورخ ناواقف نہیں۔ ہندو اور سکھ جانتے تھے کہ جب تک پنجاب کی گدی پر مسلم لیگ کے دشمن ملک خضر حیات خاں ٹوانہ قابض ہیں اس صوبہ کے پاکستان میں شامل ہونے بلکہ پاکستان بننے کا کوئی امکان نہیں۔ مسلم لیگ کی تحریک سول نافرمانی، غداری اور اسلام دشمنی کے اس سنگِ گراں کو پاش پاش کرنے کے لئے شروع ہوئی۔ اور مسلم جمہور کے زورِ بازو سے جو کامیابی حاصل ہوئی وہ صوبے، اس کے باشندوں اور مسلم لیگ کے لئے باعثِ فخر ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قائدِ اعظم کے تدبر سے پاکستان کا حصول زیادہ تر تو "کاغذی کارتوسوں" کی مدد سے یعنی سیاسی اور تدبیری (TACTICAL) طریق کار سے ہوگیا لیکن پنجاب میں حصولِ مقصد کے لئے مسلم لیگ کو حکومت کے خلاف باقاعدہ صف آرا ہونا پڑا۔ اور وہ بھی ایسی حکومت کے خلاف جو اپنی بے آئینی، جبر اور تشدد کے لحاظ سے غیر منقسم ہندوستان کی سب صوبجاتی حکومتوں سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ لیکن قوم نے اپنی تنظیم، ایثار اور ہمت و جرأت سے سب مشکلوں پر غلبہ پایا۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں نے قید و بند کی سختیاں جھیلیں۔ زعمائے قوم نے جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ کسی قسم قربانی کے اہل نہیں۔ قوم کی آواز پر لبیک کہا اور ہر طرح کی سختیاں اور ذلتیں برداشت کیں۔ قوم کی معزز اور پردہ دار خواتین نے اس تحریک آزادی میں پورا حصہ لیا۔ اور ظلم و ستم اور اسلام دشمنی کے قلعہ کو مسمار کرنے کے لئے وہی کچھ کیا جو قرونِ اولیٰ میں عرب عورتیں کفار کے ساتھ جنگ کے دوران میں کیا کرتی تھیں۔ مسلمانوں میں سول نافرمانی کی یہ پہلی تحریک تھی۔ غیر جانبدار مبصرین کا قول ہے کہ جس منظم اور موثر طریقے سے مسلمانوں نے یہ تحریک چلائی ان کی مثال باردولی کی سول نافرمانی میں بھی نہیں ملتی جسے ستیہ گرہ کے تجربہ کار ماہرین نے چلایا۔ پانچ ہی ہفتوں میں ہندوستان کی سب سے مستحکم اور جابر حکومت کا نظام درہم برہم ہوگیا اور اسے مسلم لیگ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ جو حضرات مدینۃ الجمعیۃ میں مسلم لیگ کی کم ہمتی کی نوحہ خوانی کرتے نہ تھکتے تھے، جن کے خیال میں لیگی لیڈر قوم کے لئے اپنا بال تک بیکا ہونا گوارا نہیں کرسکتے تھے[3]

وہ اس صورتِ حال سے خوش ہوتے لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ "کوثر" کے صفحات دیکھئے۔ ملک خضر حیات خاں

---

[1] ترجمان القرآن جون ۱۹۴۷ء

[2] سیاسی کشمکش حصہ دوم (ص آخر)

[3] ملاحظہ ہو مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ دوم (مولانا مودودی ص ۲۱۶)

اور ان کی یونینسٹ حکومت کی کسی بات کے خلاف اس تحریک سے پہلے، اس کے دوران میں، یا اس کے بعد ایک حرف نہیں۔ ہاں مسلم لیگ کی تحریک کے خلاف جا بجا مخالفانہ اور معاندانہ اظہار خیال ہے بلکہ علماء کو تلقین ہے کہ وہ اس جہادِ حریت کے خلاف صف آرا ہوں۔

۲۱ر فروری ۱۹۴۷ء کے "کوثر" میں یونینسٹ گورنمنٹ کے منظورِ نظر اخبار انقلاب سے ذیل کی عبارت نقل ہوتی ہے:۔

"کیا تحریک چلانے والوں سے یہ عرض کرنے کی ضرورت ہے کہ صحیح الخیال اور راسخ العقیدہ اور غیرت مند مسلمان عورتوں کے جلوسوں کو دیکھ کر شرم سے گردن جھکا لینے پر مجبور ہیں۔ ہماری برقعہ پوش بہنیں اور بعض بے پردہ عورتیں جلوسوں میں نکلتی ہیں، سڑکوں پر پھرتی ہیں، نعرے لگاتی ہیں اور بعض جوش میں آکر برقعے بھی اٹھا دیتی ہیں اور اس طرح ان تمام ذلتوں اور رسوائیوں کا نشانہ بنتی ہیں۔ جو اس قسم کے جلوسوں سے وابستہ ہیں۔"

کوثر علمائے کرام کو طعنہ دیکر گرماتا اور ابھارتا ہے کہ تحریک کے خلاف میدان میں آئیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"ہمارے نزدیک "مستورات" وہ علمائے کرام ہیں جو ایکشن کے زمانے میں تو اپنے علم و تقویٰ اور درس و تعلیم کے گوشوں سے نکل کر منبر و محراب میں جلوہ گر ہو گئے تھے مگر اب اسلامی اخلاق اور وقار کو سر بازار رسوا ہوتے دیکھتے ہیں اور اپنے حجروں میں اس طرح دبکے ہیں گویا مستورات ہیں جن کا گھروں سے باہر نکلنا شرعاً ممنوع ہے بڑے بڑے مدعیانِ توحید جو الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ پڑھنے والے کا منہ نوچ لیا کرتے تھے اب نعرۂ حیدری یا علی کا غلغلہ سنتے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے بلکہ اس سیلاب میں اپنی لیڈری کی کشتی کو بے بسی کے ساتھ بہائے لئے جا رہے ہیں۔"

کوثر نے اس تحریک کے متعلق ۷ار فروری کو ایک مستقل مقالۂ افتتاحیہ لکھا جس کا عنوان تھا —"درسِ عبرت"— اس میں لیگ کی تحریک کے متعلق ذیل کا فتوائے عالیہ درج ہے:۔

"جلسوں کی تقریریں جلوسوں کی ترتیب، ان کے نعرے اور ان کے آوازے ایک شے بھی ایسی نہیں جس کو اسلامی اخلاق و شرافت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق ہو۔"

مسلم لیگ کی تحریک برسوں کے ظلم و ستم کے خلاف ایک ردِ عمل کی حیثیت رکھتی تھی اور ایک پر جوش عوامی تحریک تھی۔ ممکن ہے کہ بعض موقعوں پر بے اعتدالیاں ظہور پذیر ہوئی ہوں مگر لیگی لیڈروں کی مسلسل کوشش تھی کہ تحریک کو ہر طرح کی بدعنوانیوں سے محفوظ رکھا جائے اور لیگی رہنما (جیسا کہ کوثر کا اعتراف ہے) بار بار لوگوں کو "متنبہ" کرتے رہے لیکن حیرت اس بات کی ہے کہ پنجاب میں برسوں یونینسٹ پارٹی کی حکومت رہی، برائے نام چند وزیر تھے لیکن فی الحقیقت انگریز آئی سی۔ ایس افسروں اور انسپکٹر جنرل پولیس کی حکومت تھی۔ جنگ کے دوران میں انہوں نے ظلم و جبر سے کام لیا اور جس طریقے سے جنگی چندے وصول کئے ہر پنجابی کو معلوم ہے۔ مسلمان صوبے میں اکثریت میں تھے لیکن لڑائی کے بعد جو وزارت قائم ہوئی اس میں اصل اقتدار لالہ بھیم سین سچر اور سردار سورن سنگھ کے ہاتھ میں تھا لیکن اس ظلم و ستم اور صریح بے انصافی کے خلاف کبھی کوثر نے احتجاج نہیں کیا۔ آپ کو ڈھونڈے سے بھی کوثر کے صفحات میں یونینسٹ گورنمنٹ کے خلاف (لیگ کی تحریک کے دوران میں یا اس سے پہلے یا بعد میں) ایک حرفِ شکایت نہ ملیگا لیکن اس ظلم و ستم اور ذلت کشی کو ختم کرنے کے لئے ایک تحریک شروع ہوتی ہے تو کوثر میں اس کی خوبیوں کے متعلق ایک لفظ نہیں فقط شکایتیں اور ملامتیں ہیں۔

خیر مسلم لیگ نے اپنی تحریک جاری رکھی۔ پولیس کی لاٹھیاں چلتی رہیں۔ جیلخانے بھر دیئے گئے۔ صوبے میں ہر طرف گرفتاریوں، ضبطیوں اور جرمانوں کا دور دورہ تھا اور اس دوران میں وہ حضرات جو لیگی قیادت کی بزدلی اور کم ہمتی کی شکایت کیا کرتے تھے اب لاٹھیاں کھانے اور جیل جانے والوں پر اپنے "تیر و نشتر" کے وار کرتے رہے لیکن انجام کار کیا ہوا۔ لیگ نے معرکہ جیت لیا۔ یونینسٹ گورنمنٹ کو مستعفی ہونا پڑا اور پاکستان کا راستہ صاف ہو گیا۔

مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ صاحب مودُودی

اور

اُن کی تحریک

دیباچہ :-

جامعۃ المبشرین وہ علمی درسگاہ ہے جس میں مولوی فاضل اور بی اے پاس کرنے کے بعد طالب علم داخل ہوتے ہیں۔ اول الذکر دو سال اور مؤخر الذکر چار سال پڑھنے کے بعد جامعۃ المبشرین کی ڈگری "شاہد" کا امتحان پاس کرتے ہیں۔ شاہد کی ڈگری طالب علم کو اسی صورت میں مل سکتی ہے جبکہ نصاب کی کتابوں کے امتحان میں کامیاب ہونے کے علاوہ وہ ایک قیمتی اور علمی مقالہ بھی امتحانی بورڈ میں پیش کرے۔

۱۹۵۴ء میں ہمارے عزیز دوست جناب مولوی دوست محمد صاحب مولوی فاضل نے جامعۃ المبشرین سے شاہد کا امتحان پاس کیا اور ڈگری حاصل کرنے کے لئے انہوں نے جماعت اسلامی کی تحریک پر مقالہ لکھا جس پر بورڈ نے انہیں شاہد قرار دیا۔

اب یہ تحقیقی مقالہ الفرقان کے اس خاص نمبر کی اشاعت میں شامل ہو رہا ہے فاضل مقالہ نویس نے نہایت محنت سے یہ مضمون مرتب کیا ہے اور اس میں جماعت اسلامی کے متعلق نہایت قیمتی معلومات جمع کر دی ہیں۔

ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مکرم مولوی صاحب کو علمی اور عملی طور پر بیش بہا ترقیات عطا فرمائے اور ان کا حامی و ناصر ہو۔ اور اس مقالہ کو بھی بہتوں کی بھلائی کا موجب بنائے۔ آمین یا ربّ العٰلمین +

خاکسار،

ابوالعطاء جالندھری

پرنسپل جامعۃ المبشرین ربوہ

۲۸/۵/۵۵

مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

اور

اُن کی تحریک

(از قلم جناب دوست محمد صاحب شاہد)

مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ہزاروں سیاسی اور مذہبی انقلاب آئے مگر ۱۸۵۷ء کے حادثۂ عظیمہ کے سوا کوئی حادثہ ایسا نہیں جس نے ان کی حیاتِ ملّی کو ایسا نقصانِ عظیم پہنچایا ہو کہ ان کے افکار و خیالات کی دنیا ہندوازم دہریت اور سب سے بڑھ کر عیسائیت کے سیلاب کی نذر ہو گئی ہو۔ اس عظیم حادثے کے نتیجے میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے جو مایوس کن حالات رونما ہوتے ان کی اصلاح کے لئے آغاز کار دو تحریکیں اُٹھیں۔ اُن میں سے ایک تحریک دار العلوم دیوبند کے قیام کے ساتھ وابستہ تھی اور دوسری تحریک کا تعلق سر سید احمد خان کے علیگڑھ محمڈن کالج سے تھا۔ یہ دونوں تحریکیں ابتدائی کوشش کے لحاظ سے نہایت قابلِ تحسین تھیں۔ بلاشبہ ان کے نتیجے میں مسلمانوں کی دو عظیم درسگاہیں معرضِ وجود میں آئیں اور ان کی وجہ سے مسلمانوں میں کچھ بیداری کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ لیکن ان دونوں تحریکوں میں نہ صرف یہ کہ باہم کوئی ربط نہ تھا بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ بالکل متضاد لائنوں پر چل رہی تھیں اور عیسائیت، آریہ سماج اور کفر و الحاد کے پیہم حملوں کی وجہ سے اسلام کے لئے جو خطرہ پیدا ہو رہا تھا اس کی طرف ان کی خاطر خواہ توجہ نہ تھی۔

اول الذکر تحریک کے نتیجے میں تو صرف ایسے شرقی دماغ تیار ہو سکے جو مغربی علوم اور جدید افکار سے مکمل بائیکاٹ کو ہی کامیابی کا ذریعہ تصور کرتے تھے اور موخر الذکر تحریک سے جن لوگوں نے اپنے آپ کو وابستہ کیا ان کی نگاہ اِس ابتدائی اور درجہ محدود مطمحِ نظر سے آگے نہ جا سکی کہ اُمّتِ مسلمہ کی ترقی کے لئے انگریزی تعلیم کا حصول ضروری ہے۔ عیسائیت اور اسی قسم کے دوسرے خلافِ اسلام افکار کے مقابلے اور ان کے استیصال سے یہ دونوں تحریکیں غافل تھیں اور یہ امر ان کی نگاہ سے بالکل اوجھل تھا کہ مسلمانوں میں مذہبی اور روحانی تنظیم کا فقدان ہے اور یہی فقدان فی الحقیقت ان کی تمام خرابیوں کا اصل ذمہ دار ہے۔ حالت یہ تھی کہ انگریز لیڈر برطانوی پالیمان میں برملا کہہ رہے تھے کہ اب ہمیں ہندوستان میں مسیحی دین کا جھنڈا لہرانے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ہندوؤں کا نیا فرقہ آریہ سماج تیز خنجر لیکر الگ سر اُٹھا رہا تھا۔ اور بڑی مصیبت یہ تھی کہ مسلمان آپس میں ہی فروعی مسائل پر دست و گریباں ہو رہے تھے اور خود اُن کے عقائد میں زبردست انقلاب آ رہا تھا۔

اِن دردناک حالات میں خدا تعالیٰ کا ایک مقدس بندہ ہندوستان کے مغربی کونے سے تنہا اٹھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے دشمنانِ اسلام کے تیز ہتھیار بیکار کر کے رکھ دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اسلام کا یہ مجاہد قادیان کا برگزیدہ انسان حضرت مرزا

غلام احمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ آج اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور ان کی انفرادی و اجتماعی بقا اور زندگی ایک مذہبی مرکز اور جماعت سے وابستہ ہے۔ آپ نے اعلان فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اپنے قدیم فیصلوں کے مطابق مجدد اور مہدی بنا کر بھیجا ہے۔ دیوبند اور علی گڑھ کے محدود نقطۂ نظر کے بالمقابل آپ نے اپنا مشن یہ قرار دیا کہ میں اسلئے آیا ہوں کہ ——"ایشیا، افریقہ، امریکہ اور دیگر تمام دنیا کی سعید روحوں کو دین واحد پر جمع کروں" (الوصیت)۔ بات بھی یہی کہ مسلم قوم کی اصلاح اور دنیا بھر میں اسلامی حکومت کا قیام صرف اسی مرکز کی بدولت عمل میں آسکتا تھا جس کی بنیاد خدا تعالیٰ کے الہام اور اس کے منشاء کے ماتحت رکھی گئی ہو۔ چنانچہ آپ نے مذکورہ بالا دونوں تحریکوں کو ان کے محدود نقطۂ نظر سے آگاہ کرتے ہوئے دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی صحیح ترقی کی راہ بتائی اور باقاعدہ ایک جماعت بنا کر لوگوں کو اپنے خاص نقطۂ نظر کے مطابق تربیت دینی شروع کی۔ چنانچہ تھوڑے سے عرصہ میں آپ کے ہاتھوں وہ گروہ پیدا ہوگیا جو مغربی اور اسلامی علوم سے پوری طرح متعارف ہو کر دنیا کو اسلامی نظام کی طرف دعوت دینے میں مصروف ہوگیا۔

آپ نے خدا تعالیٰ کے الہام سے خبر پاکر یہ پیشگوئی اعلان فرمایا:-

"یہ پیشگوئی یاد رکھو کہ عنقریب اس لڑائی میں بھی دشمن ذلت کے ساتھ پسپا ہوگا اور اسلام فتح پائے گا۔ حال کے علوم جدیدہ کیسے ہی زور آور حملے کریں، کیسے ہی نئے ہتھیاروں کے ساتھ چڑھ چڑھ کر آئیں مگر انجام کار ان کے لئے ہزیمت ہے۔ میں شکر نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ اسلام نہ صرف فلسفہ جدیدہ کے حملہ سے اپنے تئیں بچائے گا بلکہ حال کے علوم مخالفہ کی جہالتیں ثابت کر دے گا۔ .... اس کشتی کا ناخدا خداوند تعالیٰ ہے۔ وہ ہمیشہ اس کو طوفان اور بادِ مخالف سے بچاتا رہیگا۔"

(آئینہ کمالات اسلام ص ۱۹۹-۲۰۰)

دیوبندی مکتب کے خیالات پر کڑی تنقید کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:-

"میں ان مولویوں کو غلطی پر جانتا ہوں جو علوم جدیدہ کی تعلیم کے مخالف ہیں۔ وہ دراصل اپنی غلطی اور کمزوری کو چھپانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ علوم جدیدہ کی تحقیقات اسلام سے بدظن اور گمراہ کر دیتی ہے۔ اور یہ قرار دے بیٹھے ہیں کہ گویا سائنس اور اسلام بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ چونکہ خود فلسفے کی کمزوریوں کو ظاہر کرنیکی طاقت نہیں رکھتے اسلئے اپنی کمزوری کو چھپانے کیلئے یہ بات تراشتے ہیں کہ علوم جدیدہ کا پڑھنا ہی جائز نہیں۔ پس ضرورت ہے کہ آجکل دین کی خدمت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی غرض سے علوم جدیدہ حاصل کرو اور بڑے جدوجہد سے حاصل کرو۔" (ملفوظات جلد اول ص ۶۶ مطبوعہ تالیف و تصنیف قادیان)

اسی طرح آپ نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو توجہ دلائی کہ :-

"مجھے یہ بھی تجربہ ہے ..... کہ جو لوگ ان علوم ہی میں یک طرفہ پڑ گئے اور ایسے محو اور منہمک ہوئے کہ کسی اہلِ دل اور اہلِ ذکر کے پاس بیٹھنے کا ان کو موقع نہ ملا اور وہ خود اپنے اندر الٰہی نور نہ رکھتے تھے وہ عموماً ٹھوکر کھا گئے ..... بہت سے لوگ قومی لیڈر کہلا کر بھی اس رمز کو نہیں سمجھ سکے ۔ کہ علوم جدیدہ کی تحصیل جب ہی مفید ہو سکتی ہے جب محض دینی خدمت کی نیت سے ہو ۔ اور کسی اہلِ دل آسمانی عقل اپنے اندر رکھنے والے مردِ خدا کی صحبت سے فائدہ اُٹھایا جائے ۔ ..... آجکل کے تعلیم یافتہ لوگوں پر ایک اور بڑی آفت جو آ کر پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کو دینی علوم سے مطلق مَس نہیں ہوتا"

(ملفوظات جلد اوّل ص ۹۷)

ان ہر دو گروہ کی بے راہ روی پر بصیرت افروز تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا :-

"میں دیکھتا ہوں کہ اس وقت دنیا کی توجہ ارضی علوم کی طرف بہت جھکی ہوئی ہے اور مغربی روشنی نے تمام عالم کو اپنی نئی ایجادوں اور صنعتوں سے حیران کر رکھا ہے ۔ مسلمانوں نے بھی اگر اپنی فلاح اور بہتری کی کوئی راہ سوچی تو بدقسمتی سے یہ سوچی ہے کہ وہ مغرب کے رہنے والوں کو اپنا امام بنا لیں اور یورپ کی تقلید پر فخر کریں ۔ یہ تو نئی روشنی کے مسلمانوں کا حال ہے ۔ جو لوگ پرانے فیشن کے مسلمان کہلاتے ہیں اور اپنے آپ کو حامیٔ دین متین سمجھتے ہیں ان کی ساری عمر کی تحصیل کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ صرف و نحو کے جھگڑوں اور بکھیڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں"

(ملفوظات جلد اوّل ص ۳۵۲)

ان ہر دو تحریکوں پر ان کی غلطی اور ان کا محدود نقطۂ نگاہ واضح کرنے کے بعد آپ نے تعلیم اسلام کے لئے ایسی مثالی درسگاہیں قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی کہ جن میں بیک وقت دینی اور دنیوی علوم پڑھائے جائیں اور دین کو دنیا پر مقدم رکھتے ہوئے مسلمان نوجوانوں کی اس رنگ میں تربیت کی جائے کہ وہ نہ صرف اسلام کو فلسفۂ جدیدہ کے حملوں سے بچائیں بلکہ خود آگے بڑھ کر حال کے علوم مخالفہ کی جہالتیں ثابت کریں ۔

آپؑ نے مسلمانوں کو آئندہ خطرہ سے بروقت مطلع کرتے ہوئے فرمایا :-

"تعلیمی طریق میں اس امر کا لحاظ اور خاص توجہ چاہیئے کہ دینی تعلیم ابتداء سے ہی ہو ۔ اور میری ابتداء سے یہی خواہش رہی ہے اور اب بھی ہے ۔ اللہ تعالیٰ اس کو پیدا کرے ۔ دیکھو تمہاری ہمسایہ قوموں یعنی آریوں نے کس قدر حیثیت تعلیم کیلئے بنائی ۔ کئی لاکھ سے زیادہ روپیہ جمع کر لیا ۔ کالج کی عالیشان عمارت اور سامان بھی پیدا کیا ۔ اگر مسلمان پورے طور پر اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہ کریں گے تو میری بات سن رکھیں کہ ایک وقت ان کے ہاتھ سے بچے بھی جاتے رہیں گے" (ملفوظات جلد اوّل ص ۶۸)

چنانچہ آپ نے ۱۸۹۵ء میں اپنے دست مبارک سے قادیان میں ایک ایسے مثالی ادارے کا آغاز فرمایا جو بفضلہ اب تک جاری ہے اور اس کی طرز پر مزید اداروں کا قیام عمل میں آ چکا ہے۔

پھر آپ نے جو تربیت یافتہ گروہ تیار کیا آپ نے اسکی دماغی اور روحانی صلاحیتیں اُجاگر کرنے کی پوری سعی فرمائی آپ نے اسلام کے فقہی، تمدنی، معاشرتی، روحانی غرضیکہ تمام قسم کے مسائل خدا تعالیٰ کی اصولی رہنمائی میں حل کئے اور اس طرح اسلام کی روح اور اسکے علمی و عملی مفہوم کو خوبصورتی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش فرمایا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ نے اجتہاد کے دروازے بند کر دیئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ ہی وہ پہلے انسان ہیں جنہوں نے زمانہ حاضرہ میں اس باطل نظریہ کے خلاف منظم جہاد کیا کہ قرآن و حدیث کے مسائل صرف گذشتہ تفاسیر اور حواشی اور کتب میں ختم ہو چکے ہیں اور آئندہ کسی اجتہاد کی گنجائش باقی نہیں۔ چنانچہ آپ نے مسلمانوں کو آگاہ فرمایا:۔

"اے بندگان خدا یقیناً یقین رکھو کہ قرآن شریف میں غیر محدود معارف و حقائق کا ... ایسا کامل اعجاز ہے جس نے ہر زمانہ میں تلوار سے زیادہ کام کیا ہے۔ اور ہر ایک زمانہ اپنی نئی حالت کے ساتھ جو کچھ شبہات پیش کرتا ہے یا جس قسم کے اعلیٰ معارف کا کوئی دعویٰ کرتا ہے اس کی پوری مدافعت اور پورا الزام اور پورا پورا مقابلہ قرآن شریف میں موجود ہے ... قرآن شریف کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے اور جس طرح صحیفۂ فطرت کے عجائب و غرائب ... ختم نہیں ہو سکے بلکہ جدید در جدید پیدا ہوتے جاتے ہیں یہی حال ان صحف مطہرہ کا ہے تا خدا تعالیٰ کے قول اور فعل میں مطابقت ثابت ہو۔" (ازالہ اوہام صفحہ ۳۱۰ مطبوعہ انجمن اشاعت اسلام لاہور)

قرآن کریم کی اس وسعت اور ہمہ گیری کا ذکر ایک دوسرے رنگ میں آپ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"قرآن شریف حکمتوں اور معارف کا جامع ہے ..... ہر ایک امر کی تفسیر وہ خود کرتا ہے اور ہر ایک قسم کی ضرورتوں کا سامان اس کے اندر موجود ہے۔ وہ ہر ایک پہلو سے نشان اور آیت ہے اور اگر کوئی اس کا انکار کرے تو ہم ہر پہلو سے اس کا اعجاز ثابت کرنے اور دکھلانے کو تیار ہیں۔" (ملفوظات جلد اول صفحہ ۵۰)

پس موجودہ زمانہ میں اسلام اور قرآن کے ضابطۂ حیات ہونے کا سبق سب سے پہلے آپ نے ہی دیا اور اسی بنیاد پر آپ نے نئے اجتہاد و فکر کی دعوت بھی دی۔ چنانچہ آپ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"اس ملک میں اکثر مسائل زیر و زبر ہو گئے ہیں۔ کل تجارتوں میں ایک نہ ایک حصہ سود کا موجود ہے اس لئے اس وقت نئے اجتہاد کی ضرورت ہے۔"

(البدر یکم نومبر ۱۹۰۲ء)

بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام نے اجتہاد کی جن لائنوں پر تجدید کی بنیاد رکھی اس نے دنیائے اسلام میں ایک نئے علمی باب کا افتتاح کیا اور قلم و زبان سے ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ چنانچہ اس زمانہ میں آپ کے جاری کردہ رسالہ ریویو آف ریلیجنز نے جو اسلامی خدمات سرانجام دیں اور جس طرح شعبۂ حیات کے ہر گوشے پر نئی روشنی ڈالی وہ ایک ناقابل فراموش علمی خدمت ہے۔ اس رسالہ نے ہندوستان ہی نہیں خصوصاً مغربی ممالک کو بھی اسلام سے روشناس

کرانے میں سب سے زیادہ مؤثر کام کیا اور قبولیت کی سند حاصل کی ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۰۲ء سے جاری ہے اور تقریباً ان تمام علمی اور مذہبی مضامین کا انسائیکلوپیڈیا ہے جن کی ضرورت آج شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ خصوصاً مغربی دنیا کے شبہات و وساوس کے جواب میں اپنی نظیر آپ ہے۔

الغرض بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جہاں دلائل و براہین کے میدان میں ایک فتح نصیب جرنیل کی طرح دشمنانِ اسلام کا نہایت کامیابی سے مقابلہ کیا وہاں آپؑ نے علومِ جدیدہ کے مقابل اسلامی تعلیمات کی فوقیت، ان کی جامعیت، اجتہاد کی ضرورت نیز نظامِ تعلیم میں وسیع انقلاب برپا کرنے کے لئے گرانقدر مساعی فرمائیں۔ حتیٰ کہ اس وقت کے قریباً ہر صاحبِ بصیرت مسلمان اخبار نے آپؑ کی ان ہمہ گیر خدمات کا اعتراف کیا اور انہیں خراجِ تحسین ادا کیا۔

درحقیقت آپؑ کا جدید علم کلام، آپؑ کا لٹریچر اور اسلامی نظام کے قیام کی تمام کوششیں خدا تعالےٰ کے شرفِ مکالمہ و مخاطبہ کی تجلیات تھیں اور یہی وہ بے پناہ طاقت تھی جو مادیت کے زمانے میں آپؑ کے ہاتھوں یہ عظیم کارنامہ سرانجام دلا رہی تھی۔

چنانچہ آپؑ نے انہی تجلیات کی طرف دنیا والوں کو توجہ دلاتے ہوئے یہ بصیرت افروز اعلان فرمایا کہ:۔

"میں بار بار کہتا ہوں اور بلند آواز سے کہتا ہوں کہ قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت رکھنا اور سچی تابعداری اختیار کرنا انسان کو صاحبِ کرامات بنا دیتا ہے اور اس کامل انسان پر علومِ غیبیہ کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ اور دنیا میں کسی مذہب والا روحانی برکات اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں اس میں صاحبِ تجربہ ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بجز اسلام تمام مذہب مُردے، ان کے خدا مُردے اور خود وہ تمام پیرو مُردے ہیں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ زندہ تعلق ہو جانا بجز اسلام قبول کرنے کے ہرگز ممکن نہیں ہرگز ممکن نہیں۔

اے نادانو! تمہیں مُردہ پرستی میں کیا مزہ ہے اور مُردار کھانے میں کیا لذّت؟ آؤ میں تمہیں بتلاؤں کہ زندہ خدا کہاں ہے اور کس قوم کے ساتھ ہے۔ وہ اسلام کے ساتھ ہے۔ اسلام اس وقت موسیٰ کا طور ہے جہاں خدا بول رہا ہے۔ وہ خدا جو نبیوں کے ساتھ کلام کرتا تھا اور پھر چُپ ہو گیا آج وہ ایک مسلمان کے دل میں کلام کر رہا ہے۔ خدا کے نشان بارش کی طرح برس رہے ہیں۔ کیا تم میں سے کوئی نہیں جو سچا دل لے کر میرے پاس آوے۔ کیا ایک بھی نہیں؟"

(ضمیمہ انجام آتھم طبع اول ص۳)

خلاصہ یہ کہ آپؑ کے ان عظیم کارناموں کی وجہ سے سعید الفطرت لوگ آپؑ کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے اور آپؑ کے قائم کردہ سلسلے کے ساتھ ان کی وابستگی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ ادھر آگے چل کر بیرونی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطنت ترکیہ کے ٹکڑے ہو جانے کے باعث خلافت عثمانیہ ختم ہو گئی۔ مسلمانوں کی اس زبوں حالی سے پریشان ہو کر اور انسانی خلافتوں کی بے بسی دیکھ کر مسلمانوں کا ایک طبقہ خواہ وہ کیسا ہی قلیل کیوں نہ سہی خدائی خلافت کے دامن سے وابستہ ہو کر مسلمانوں کی فلاح و نجاح کے حقیقی راستے پر گامزن ہو گیا۔

سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور اُنکے ابتدائی ایام

عین اسی زمانہ میں ایک آدھ گروہ ایسا بھی تھا جو ان حالات میں اگرچہ احمدیت کے حلقے میں تو نہ پہنچ سکا البتہ اسکے لٹریچر کی طرف اُسے ضرور توجہ ہو گئی تھی۔ انہی متاثرین کے حلقے میں دہلی کے ایک معزز گھرانے کا چشم و چراغ بھی تھا جس نے چند سال قبل ہی صحافتی زندگی میں قدم رکھا تھا اور روزنامہ "تاج" (جبلپور) اور "مسلم" (دہلی) کی ادارت کے فرائض سرانجام دینے کے بعد جمعیۃ العلماء ہند کے آرگن "الجمعیۃ" کی ادارت کر رہا تھا۔ یہ نوجوان جماعت اسلامی کے موجودہ امیر جناب سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی تھے۔ ہمارے خیال میں جناب مولانا مودودی صاحب کو ابتداءً احمدیت کے لٹریچر کی طرف متوجہ کرنیکا باعث خلافت ترکی کے سقوط کا دردناک سانحہ، مسلمانوں کی لامرکزیت اور تشتت و افتراق کے الم انگیز نظاروں کے علاوہ جماعت احمدیہ کے وہ دینی کارنامے تھے جن کا غلغلہ ان دنوں خود مسلم پریس کے ذریعہ ہندوستان کے طول و عرض میں بلند ہو رہا تھا اور مسلمانوں کے مشہور لیڈر اسکی تبلیغی خدمات کا کھلے بندوں اعتراف کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ شاعر مشرق کا مندرجہ ذیل نظریہ بھی آپکی کشش کا موجب ہوا ہو۔

(۱) "It will appear at once how strikingly the author has anticipated the chief plan of the Hegelian dialectics and how greatly he has emphasised the Doctrine of the Logos — a doctrine which has always found favour with almost profound thinkers of Islam and in recent times has been readvocated by M. Ghulam Ahmad of Qadian the probably profoundest theologian among modern Indian Muhammadans."

Indian Anti Quary
Vol. XXIX, 1900
Page 237 – 246

ترجمہ:۔ "یعنی الفور واضح ہو جائے گا کہ مصنف نے ہیگل کی جدلیات کے بنیادی پہلو کو نمایاں طور پر اس سے بہت پہلے ہی بیان کر دیا ہے۔ اور کس طرح اس کے نظریۃ Logos پر زور دیا ہے۔ اور یہ نظریۃ ایسا ہے جو دقیق نگاہ اسلامی مفکّرین کو ہمیشہ مرغوب رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہ نظریۃ مرزا غلام احمدؑ قادیانی نے ازسر نو پیش کیا ہے جو غالباً جدید ہندی مسلمانوں میں سب سے بڑے دینی مفکّر ہیں۔" (رسالہ انڈین اینٹی کویری جلد ۲۹ ستمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۲۳۳)

(۲) "پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔" (ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر۔ شائع کردہ اقبال اکیڈمی لاہور)

بہرحال احمدیت سے متاثر ہونے کے باعث تھا؟ کچھ ہوں اصل مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ بعض قرائن کے مطابق سقوطِ خلافت کے ایام میں جناب مودودی صاحب جماعتِ احمدیہ کے لٹریچر کا کچھ نہ کچھ مطالعہ کر چکے تھے اور آپ کے لئے ایک بہتری موقع تھا کہ آپ "سقوطِ خلافت" کے حادثہ سے صحیح رنگ میں فائدہ اٹھا کر خلافتِ برحق سے وابستہ ہو جاتے مگر افسوس انہی سلسلہ سے منسلک ہونے کی بجائے آپ کو خود اپنی "امامت" و "اقتدار" کے لئے یہ ترکیب سوجھی کہ دوسرے علماء کی طرح حضرت مسیح موعودؑ کی مخالفت تو کی جائے مگر آپ کے علم کلام سے بائیکاٹ کرنے کی بجائے استفادہ کیا جائے اور اس ڈھنگ پر ایک جدید انداز میں لٹریچر شائع کیا جائے۔ ادب اور انگریزی الفاظ کی چاشنی سے اس کی دلکشی میں اضافہ کے سامان پیدا کئے جائیں۔ بہرحال یہ وہ سکیم تھی جس کو عملی جامہ پہنانے پر ابتدا میں آپ نے کافی غور و فکر کیا۔ اس وقت تک کی ساری زندگی آپ کے اس غور و فکر کی عملی تفسیر ہے اور آئندہ کے اوراق اس کے لئے ایک عملی خاکہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

الجہاد فی الاسلام کے متعلق مودودی صاحب کے مضامین

دسمبر ۱۹۲۶ء میں جب سوامی شردھانند کو دلی میں قتل کیا گیا

تو جناب مودودی صاحب نے انہی دنوں اخبارات میں گاندھی جی کا یہ بیان پڑھا کہ:

> "اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے
> جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور
> آج بھی تلوار ہے۔" (الجہاد فی الاسلام)

جس پر آپ نے "الجمعیۃ" میں مضمون کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا اور ساتھ ہی ناظم جمعیۃ العلماء کی طرف سے ایڈیٹر صاحب "الفضل" (قادیان) کو بیاطلاع دی گئی کہ:

> "جمعیۃ العلماء کے اخبار "الجمعیۃ" میں
> ایک پُر از معلومات سلسلہ مضامین شروع کیا
> جا رہا ہے جس میں یہ بتایا جائے گا کہ دنیا میں
> حقیقی امن و صلح کا پیغام اگر کوئی مذہب
> لایا ہے تو وہ اسلام ہے۔"
>
> (الفضل ۱۱ر فروری ۱۹۲۷ء)

یہ مضمون جو "الجہاد فی الاسلام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس کا ابتدائی حصہ جس میں اسلام کی مدافعانہ جنگ کا ذکر کیا گیا ہے صاف ظاہر کر رہا ہے کہ آپ نے غیر مسلموں کو اسلام کی صلح کن پالیسی سے آشنا کرنے کیلئے جماعت احمدیہ کے نظریۂ جہاد کی اقتدا کا پہلا قدم اٹھایا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ آپ نے کتاب کی ابتدا میں تو اپنے پہلے ہی قدم کو صداقت سمجھ لیا ہے مگر آخر کتاب میں اپنی طرف سے ایک "مصلحانہ جنگ" کا ذکر کر کے اپنے گذشتہ نظریہ پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے۔ اور طرفہ یہ کہ آپ نے اس کے جواز کی غرض سے کوئی نئی آیت پیش نہیں کی بلکہ صرف وہی آیات پیش کر دی ہیں جن سے آپ ابتدائی حصہ کتاب میں اسلام کی مدافعانہ پالیسی کا استدلال کر چکے ہیں۔ جو آیات زیرِ استدلال میں نئی پیش کی ہیں انہیں سرے سے جنگ کرنے کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

قرآن مجید کو اپنے نظریہ کے مخالف پا کر آپ نے کمال ہوشیاری سے "فساد اور فتنے" میں بے اندازہ وسعت پیدا کر دی ہے۔ اور بزورِ تلوار عادلانہ نظامِ حکومت کے قیام کو (الجہاد فی الاسلام صفحہ ۹۵) "مصلحانہ جنگ" کا نام دیکر اس کا جواز ثابت کرنے کی کوشش

کی ہے۔ ہر انسان آپ کی اس دورُخی پالیسی کو دیکھ کر ورطۂ
حیرت میں پڑ جاتا ہے اور اصل معاملہ سے آشنا نہیں ہو سکتا
مگر معلوم ہوتا ہے کہ جناب مودودی صاحب نے اس کتاب
کے آغاز میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نظریہ کو اپنانے
کی کوشش شروع کی تو انہیں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر اس کے
ساتھ کوئی نیا افسانہ گھڑا گیا تو کام نہیں چلے گا اس لئے
انہیں تصنع اور بناوٹ سے کام لے کر "مصلحانہ جنگ" کی
ایک نئی اصطلاح تیار کرنی پڑی لیکن یہ صداقت آج
بھی چھپ نہیں سکتی کہ اگر مولانا مودودی صاحب کو جماعت
احمدیہ کے مسلک پر اعتماد نہ ہوتا تو آپ اس عقیدہ کے موجود
ہیں کہ :۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۳ برس تک
عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، وعظ و تلقین
کا جو موثر سے موثر انداز ہو سکتا تھا اُسے
اختیار کیا، مضبوط دلائل دیئے، واضح حجتیں
پیش کیں، فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت
سے دلوں کو گرمایا، اللہ کی جانب سے محیر العقول
معجزے دکھائے لیکن قوم نے آپ کی دعوت
قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب وعظ
و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام
نے ہاتھ میں تلوار لی تو دلوں سے رفتہ رفتہ
بدی اور شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا۔
طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے
روحوں کی کثافتیں دُور ہو گئیں اور صرف
یہی نہیں کہ آنکھوں سے پردہ ہٹ کر حق کا نور
صاف عیاں ہو گیا بلکہ گردنوں میں وہ
سختی اور سروں میں وہ نخوت بھی باقی نہیں
رہی جو ظہورِ حق کے بعد انسان کو اس کے آگے
جھکنے سے باز رکھتی ہے ۔۔ اسلام کی تلوار
نے پردوں کو چاک کر دیا۔ ان حکومتوں
کے تختے الٹ دیئے جو حق کی دشمن اور
باطل کی پشت پناہ تھیں۔ (الجہاد فی الاسلام
طبع دوم صفحہ ۱۳۸-۱۳۷)

مسٹر گاندھی کے اس نظریہ کا جواب لکھنے کی جرأت ہی
کب کر سکتے تھے کہ :۔

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا
ہے جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی
تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے"

(الجہاد فی الاسلام صفحہ ۱)

پس دشمنانِ اسلام کے جواب میں مودودی صاحب
کے لئے لازم یہ تھا کہ آپ جماعت احمدیہ کے مسلک کی تقلید
کرتے۔ مگر اس موقع پر آپ نے ظلم یہ کیا کہ صرف یہ سوچ کر
کہ آپ پر تقلید کا الزام نہ آئے آپ نے بڑی فصاحت و
بلاغت سے خود دشمنانِ اسلام کی ہمنوائی قبول کر لی مگر
حق اختیار کرنا قبول نہ کیا۔ اور خواہ مخواہ "مصلحانہ جنگ"
کی ایک نئی صورت اپنی طرف سے ایجاد کر کے کتاب کے ساتھ
شامل کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود اس کے کہ کئی مواقع
پر آپ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مسلک
کی برتری کا عملاً اعتراف بھی کر چکے ہیں لیکن آپ کے لٹریچر
میں "مصلحانہ جنگ" کے غلط خیال نے ایسی نمایاں جگہ
لے لی ہے کہ اصل حقیقت لوگوں کی نظر سے اوجھل ہی
رہتی چلی آ رہی ہے۔

ابتداء میں آپ نے اپنے خود ساختہ نظریہ جہاد کو
شاید محض جبلت کے طور پر پیش کیا تھا۔ مگر یوں معلوم
ہوتا ہے کہ جب اس کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات
جلد جلد بدلتے گئے اور ۱۹۳۷ء کے قریب مسلمانوں کیلئے
عسکری پروگرام پیش کرنے والی جماعتیں خاکسار وغیرہ
کھڑی ہو گئیں تو آپ نے اس جنگ پسندی کو "اصلِ اسلام"

سمجھ کر اسے متشددانہ رنگ دینا شروع کر دیا تھا لیکن اس کا پورا پورا اظہار آپ نے کسی آئندہ وقت پر ملتوی کر دیا تھا اور اس کے بالمقابل حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تجدیدی مسائل کو اپنانے کا مکمل آغاز آپ نے ۱۹۳۳ء میں رسالہ "ترجمان القرآن" کے ذریعہ سے کر دیا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے افکار کی عکاسی۔

"ترجمان القرآن" کہنے کو تو مودودی صاحب کے مضامین کا مجموعہ تھا مگر اس کی عملی حیثیت یہ تھی کہ بعض دفعہ اس کے صفحہ صفحہ اور سطر سطر سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے علمی افکار کی جھلک نمایاں ہوتی تھی۔ "ترجمان القرآن" نے اپنے ابتدائی دور میں یہ فرائض کس خوش اسلوبی سے ادا کئے۔ اس کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی زندگی کے کتنے دور تھے۔ سو معلوم ہونا چاہئے کہ مولانا مودودی صاحب کی زندگی کے چار اہم دور ہیں۔

اوّل:- وہ دور جس میں آپ نے احمدیت کا مطالعہ شروع کیا اور اس سے ذاتی فائدہ اٹھانے کیلئے گہرے غور و فکر سے کام لیا۔ یہ دور تحریک خلافت کے ایام سے شروع ہو کر ۱۹۳۲ء تک چلا جاتا ہے۔

دوم:- دوسرا وہ دور ہے جبکہ آپ نے "ترجمان القرآن" کے مضامین میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعتقادات و خیالات کی محض علمی تقلید کی۔ یہ دور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۷ء تک کا درمیانی عرصہ ہے۔ اس میں بھی آپ آسمانی خلافت اور امام کی روشنی سے محروم ہونے کے باعث پورا اعتدال پر قائم نہ رہ سکے۔

سوم:- تیسرا وہ دور ہے جبکہ آپ نے نہایت بھونڈے طور پر عملی شکل میں تقلید شروع کی اور جماعت احمدیہ کے نظام کے مطابق نئی جماعت اور نئے مرکز کی تعمیر کی طرف توجہ دی۔ یہ دور ۱۹۴۱ء کے بعد سے لیکر قریب قریب انقلاب ہجرت تک وسعت رکھتا ہے۔

چہارم:- قیام پاکستان سے اسوقت تک کا دور جس میں آپ نے اپنے پروگرام سے کنارہ کشی اور لیگیوں کی طرح محض اقتدار و سیاست کے چور دروازوں میں داخل ہونے کو اپنا لائحہ عمل قرار دے رکھا ہے۔

ابتدائی صفحات میں ہم نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مجتہدانہ کارناموں پر روشنی ڈالنے کے بعد مودودی صاحب کے دور اوّل کا مختصر سا بیان ہدیہ ناظرین کر دیا ہے اسلئے اس کا اعادہ کئے بغیر ہم آپ کے دوسرے دور کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

اس زمانہ میں آپ نے زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے مسائل میں حضرت مسیح موعود سے کس طرح تفصیلاً استفادہ کیا یہ تو اپنی جگہ ایک علیحدہ مضمون ہے اس جگہ مودودی صاحب کے چند اصولی افکار بتائے جاتے ہیں جو آپ نے "ترجمان القرآن" کے ذریعہ مسلمانوں کے سامنے رکھنے شروع کئے اور جن کی موجودہ ہیئت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عملی طریق کار اور آپ کی تحریرات سے ترکیب یافتہ تھی۔ یہ عملی افکار کیا ہیں' ان کا مختصر سا خاکہ جناب مودودی صاحب کے اپنے الفاظ میں درج کرتے ہیں:-

تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں کے حملوں کا جواب

"یہ وقت ہے کہ مغربی قوموں کے سامنے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو پیش کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ یہ ہے وہ مطلوب جس کی طلب میں تمہاری جانیں بیقرار ہیں۔ یہ ہے وہ امرت رس جس کے تم پیاسے

ہو۔ یہ ہے وہ شجرِ طیب جس کا اصل بھی صالح ہے اور شاخیں بھی صالح ہیں جس کے پھل میٹھے بھی ہیں اور جان بخش بھی۔"

(ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۳۵ء)

اس جگہ ہم اس افسوسناک حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جناب مودودی صاحب نے ابتداء میں جس درجہ درد اور سوز کے ساتھ غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام کیطرف مسلمانوں کو توجہ دلائی اسی درجہ بے رخی سے بعد کو اپنے غفلت کا ثبوت دیا اور اتنی بڑی اہم چیز کو نظر انداز کرنے کے لئے آپ نے اس بہانہ سے اپنا پیچھا چھڑالیا کہ:۔

"محض عیسائی مشنریوں کے ڈھنگ پر اسلام کی تبلیغ کر دینا لاحاصل ہے۔ عقائد کی اصلاح ایک سال نہیں ہزاروں رسالے اگر لاکھوں کی تعداد میں بھی شائع کر دیئے جائیں تو یہ حالات درست نہیں ہو سکتے۔ محض زبان اور قلم سے اسلام کی خوبیوں کو بیان کر دینے سے کیا فائدہ۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ ان خوبیوں کو واقعات کی دنیا کے سامنے لایا جائے۔"

(ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۴ء)

ان الفاظ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ مودودی صاحب کو اسلام کے تقاضوں کا اتنا احساس نہ تھا جتنا شہرت و عزت کا احساس تھا ورنہ تبلیغ اسلام کے اس میدان کو چھوڑ کر جہاں اسلام اور غیر اسلام کی کشمکش جاری تھی آپ کسی اور جگہ اپنا کیمپ نہ لگاتے لیکن خیر اچھا ہوا کہ آپ نے موجودہ عقائد کے ساتھ دشمنانِ اسلام کے سامنے پیش ہونے کی جرأت نہ کی ورنہ مجاہدین احمدیت کی مشکلات میں اور اضافہ ہو جاتا۔ اور اسلام کی بدنامی الگ ہوتی۔

علماء اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی حالت زار کا یوں نقشہ کھینچا:۔

دنیائے اسلام میں دو گروہ

"اس وقت دنیائے اسلام میں ہر جگہ دو ایسے گروہ پائے جاتے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک گروہ اسلامی علوم اور اسلامی ثقافت کا علمبردار ہے مگر زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کے قابل نہیں۔ دوسرا گروہ مسلمانوں کی علمی، ادبی اور سیاسی گاڑی کو چلا رہا ہے مگر اسلام کے اصول و مبادی سے ناواقف ہے۔" (ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۳۵ء)

"میں اس حالت کو دیکھ رہا ہوں، اور اس کا جو خوفناک انجام میری آنکھوں کے سامنے ہے اگرچہ رہنمائی کے لئے جس علم عقل اور سیاست کی ضرورت ہے وہ مجھ کو حاصل نہیں۔ نہ اتنی قوت میسر ہے کہ ایسے بگڑے ہوئے حالات میں اتنی بڑی قوم کی اصلاح کر سکوں لیکن اللہ نے دل میں ایک درد دیا ہے اور وہی درد مجبور کرتا ہے کہ جو تھوڑا سا علم اور ذرا سی بصیرت اللہ تعالیٰ نے بخشا ہے اس سے کام لیکر مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں کو اسلامی تعلیم کے اصل منبع اور اسلامی تہذیب کے اصل سرچشمہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دوں۔" (ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۳۵ء)

طبقہ علماء کو اپنے حقیقی فرائض کیطرف متوجہ کرتے ہوئے لکھا:۔

علماء کی حالت

"علماء کیلئے اب یہ وقت نہیں ہے کہ وہ الٰہیات و مابعد الطبیعۃ

اور فقہی جزئیات کی بحثوں میں لگے رہیں ۔
دراصل ضرورت ان مسائل کے سمجھنے کی ہے
جو ناخدا شناسی اور لادینی کی بنیاد پر علم
اور تمدن میں صدیوں تک نشوونما پاتے
رہنے سے پیدا ہو گئے ہیں ۔ ان کی پوری
تشخیص کر کے اصول اسلام کے مطابق
ان کا قابل عمل حل پیش کرنا وقت کا اصل
کام ہے ۔ اگر علمائے اسلام نے اپنے آپ کو
اس کام کا اہل نہ بنایا اور اسے سر انجام
دینے کی کوشش نہ کیں تو پھر دنیائے اسلام
کا جو حشر ہوگا سو ہوگا خود دنیائے اسلام
بھی تباہ ہو جائیگی "

(ترجمان القرآن مارچ ۱۹۳۶ء)

حضرت اقدسؒ کے ارشادات کی روشنی میں فکر و اجتہاد سے مستغنی ہونے والے مسلمانوں سے خطاب کیا ۔

فکر و اجتہاد سے استغنیٰ

"ذہنی غلبہ و استیلا کی بنا دراصل فکری اجتہاد اور علمی تحقیق پر قائم ہوتی ہے ۔ جو قوم اس راہ میں پیشقدمی کرتی ہے وہی دنیا کی رہنما اور قوموں کی امام بن جاتی ہے ...... مسلمان جب تک تحقیق و اجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے رہے تمام دنیا کی قومیں انکی پیرو اور مقلد رہیں ...... مگر جب انھوں نے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا تو گویا انھوں نے خود دنیا کی رہنمائی سے استعفیٰ دیدیا ۔" (ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۳۴ء)

انہیں مسائل اسلامی میں نئے اجتہاد کا احساس دلانے کے لئے لکھا :-

نئے اجتہاد کی ضرورت

"اسلام میں ایک نشاۃ جدیدہ کی ضرورت ہے (Renaissance) پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا ۔"

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۳۴ء)

حضرت اقدسؒ کے نقطۂ خیال کی تائید میں علوم جدیدہ اور اسلام کی کشمکش کے متعلق تحریر فرمایا :-

علوم جدیدہ اور اسلام

"ایک ہوشمند اور بالغ النظر آدمی کے لئے اس خیال سے ہیبت زدہ ہونیکی کوئی وجہ نہیں کہ اب علوم جدیدہ اور انکشافات حاضرہ نے عقل و خیال کی نئی طرحیں ڈالی ہیں اور حریت نے فکر و ضمیر کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے لہذا اب خدا جانے مذاہب کا حشر کیا ہو ۔ وہ تو ان علوم و انکشافات پر ایک تحقیقی نظر ڈال کر دیکھیگا کہ ان میں جو چیزیں مذہب سے متصادم ہو رہی ہیں وہ یقینی بھی ہیں یا نہیں ۔"

(ایضاً جولائی ۱۹۳۴ء)

"مغربی علوم و فنون بجائے خود سب کے سب مفید ہیں اور اسلام کو ان میں سے کسی کے ساتھ دشمنی نہیں بلکہ ایجاباً میں یہ کہونگا کہ جہاں تک حقائق علمیہ کا تعلق ہے اسلام ان کا دوست ہے اور وہ اسلام کے دوست ہیں ۔ دشمنی دراصل علم اور اسلام میں نہیں بلکہ مغربیت اور اسلام میں ہے ۔ اکثر علوم میں اہل مغرب

اپنے چند مخصوص اساسی تصورات بنیادی نقطہ ہائے آغاز اور زاویہ ہائے نظر رکھتے ہیں جو بجائے خود ثابت شدہ حقیقت نہیں بلکہ محض ان کے وجدانیات سے ہے۔"
(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۳۶ء)

"بدقسمتی سے تنہا حضرت نیاز ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑا گروہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مذہب کی شمع صرف گذشتہ زمانے کی تاریکی میں ہی جل سکتی تھی۔ علوم جدیدہ کا آفتاب طلوع ہونے کے بعد اس کا روشن ہونا مشکل ہے۔" (ایضاً جولائی ۱۹۳۳ء)

حضرت اقدسؒ نے مسلمان بچوں کی تعلیم کے متعلق جس خطرہ کا اظہار فرمایا تھا اُسے یقینی کہتے ہوئے آواز بلند کی:-

نظام تعلیم میں انقلاب "سرسید تحریک نے ایک حد تک ہماری دنیا تو ضرور بنادی ہے مگر جتنی دنیا بنائی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑا..... سوال یہ ہے کہ کیا دائماً ہماری یہی تعلیمی پالیسی ہونی چاہیئے۔ اگر یہی ہماری دائمی پالیسی ہو تو اسلئے بھی علیگڑھ کی کوئی ضرورت اب باقی نہیں ہے۔ اس ہندوستان کے ہر بڑے مقام پر ایک علیگڈھ موجود ہے۔ جہاں سے دھڑا دھڑ اینگلو محمڈن اور اینگلو انڈین نکل رہے ہیں۔ پھر یہی بھری فصل کاٹنے کے لئے ہم کو اپنا ایک مستقل مزارعہ رکھنے کی حاجت ہی کیا ہے۔ اگر درحقیقت اس حالت کو بدلنا مقصود ہے تو ذرا ایک حکیم کی نظر سے دیکھئے کہ خرابی کے اصل اسباب کیا ہیں اور اُن کو دُور کرنے کی صحیح صورت کیا ہے۔"

"آپ کے تعلیمی اسٹاف میں علاوہ اور متفرقین بھر گئے ہیں۔ ان کو رخصت کیجئے۔ خوش قسمتی سے ہندوستان میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو چکی ہے جو علوم جدیدہ میں بصیرت رکھنے کے ساتھ دل و دماغ اور نظر و فکر کے اعتبار سے پورے مسلمان ہیں۔ ان بکھرے ہوئے جواہر کو جمع کیجئے تاکہ وہ جدید آلات سے اسلامی نقشہ پر ایک اسٹیمر بنائیں۔"
(ترجمان القرآن اگست ۱۹۳۶ء)

انٹرمیڈیٹ بی۔ اے وغیرہ کلاسز کے لئے ایک اسلامی نصاب کی مفصل تجویز پیش کرتے ہوئے آپ نے لکھا:-

"میں چاہتا ہوں کہ علیگڈھ کو نہ صرف ہندوستان کا بلکہ تمام دنیائے اسلام کا دماغی مرکز بنا دیا جائے۔"

"میں اپنے اس بیان کی اس طوالت پر عذرخواہ ہوں مگر اتنی تطویل و تفصیل میرے لئے ناگزیر تھی۔ کیونکہ میں بالکل ایک نئے راستے کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ جس کے نشانات کو پہچاننے میں خود مجھے غور و فکر کے کئی سال صرف کرنے پڑے ہیں۔ میں ضمناً اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ مسلمانوں کے مستقل قومی وجود اور ان کی تہذیب کے زندہ رہنے کی اب کوئی صورت بجز اسکے نہیں کہ ان کے طرز تعلیم و تربیت میں انقلاب پیدا کیا جائے اور وہ انقلاب ان خطوط پر ہو جو میں نے آپکے سامنے پیش کئے ہیں۔" (ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۳۶ء)

قادیان کی طرح ایک اور مرکز کے از سرِ نو قیام کی تجویزیں پیش کیں:-

دارالاسلام کا تخیل "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

جس طریق سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی
دُنیا میں انقلاب برپا کیا تھا اسکی تفصیلات
بیان کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں صرف اس امر
کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ادارۂ
دارالاسلام کا تخیل اس اُسوۂ پاک کے غائر
مطالعہ سے پیدا ہُوا ہے۔"

"اب جو لوگ اسلامی طرز کا انقلاب
کرنا چاہتے ہیں ان کو ہر اُس طریقہ کی طرف
رجوع کرنا چاہیئے۔ اگر ہم ہندوستان سے
نکل کر کہیں آزاد فضا میں جا سکتے جہاں مدینہ
طیبہ کی طرح دارالاسلام بنایا جا سکے تو کم از کم
اس ملک میں الٰہی تربیت گاہیں بنانی چاہئیں
جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جائے۔
...... اس قسم کی درسگاہوں میں ایسے لوگوں
کو جمع کیا جائے جو سچے دل سے اسلام کی خدمت
کرنا چاہتے ہیں ...... وہاں کے کام کا
نقشہ وہی ہو جو نبی صلعم کے کام کا نقشہ تھا۔"

"اس تصریح سے واضح ہو جاتا ہے
کہ یہ تحریک جو میں پیش کر رہا ہوں نہ تو
ارتجاعی (reactionary) تحریک ہے
نہ اس قسم کی ارتقائی تحریک ہے جس کے پیش نظر
صرف مادی ارتقاء ہو۔ میرے پیش نظر جو
تربیت گاہ ہے ..... اس کے لئے اگر کوئی
نمونہ ہے تو وہ صرف مدینۃ الرسول اور اس
حزب اللہ میں ہے جسے نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم
نے مرتب کیا تھا۔" (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۷ء)

اور آگے بڑھ کر اس خواہش کا اظہار کیا کہ (جماعت احمدیہ
کی مانند) ایک نئی جماعت تیار کی جائے۔ چنانچہ لکھا۔

جماعت بنائیے!

"ایمانداروں کی ایک جماعت
بنائیے جو نہ صرف اس راستے
پر چلیں بلکہ دُنیا کو بھی اس کی طرف کھینچنے کی کوشش
کریں۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین نے
ہمیشہ اسی غرض کے لئے جہاد کیا ہے ....
.... یہ خیال کہ زندگی کا دریا جس رُخ پر
بہ گیا اس سے وہ پھیرا نہیں جا سکتا عقلاً
بھی غلط ہے اور تجربہ اور مشاہدہ بھی اسکے
خلاف گواہی دیتا ہے ...... اسکی سب سے
زیادہ نمایاں مثال خود اسلام میں موجود ہے۔
محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب دُنیا میں تشریف لائے
.... چند سال کی مختصر مدت میں اپنی
تبلیغ و جہاد سے دُنیا کے رُخ کو پھیر کر اور
دُنیا کے رنگ کو بدل کر چھوڑا۔"
(ترجمان القرآن مئی ۱۹۳۶ء)

قارئین کرام! مندرجہ بالا بیانات پڑھ لینے کے بعد اب
میرے اس دعویٰ کی صداقت میں کوئی شبہ باقی رہ سکتا
ہے کہ وہ تمام خطوط جو مودودی صاحب کی اپنی دماغی
کاوشوں کا ثمرہ نظر آتے ہیں وہ قریب قریب حضرت
مسیح موعود علیہ السلام کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ علماء اور
جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی کشمکش، فکر و اجتہاد سے استغنیٰ،
علوم جدیدہ اور اسلامی شریعت، تعلیم کے نظام میں تعلق
اور مرکزیت کی اہمیت۔ غرضیکہ کوئی بھی تو ایسا نکتہ نہیں
جس پر مودودی صاحب نشاندہی کر سکے یہ کہہ سکیں کہ انہیں
انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی رہنمائی حاصل نہیں
کی۔ بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب مسلمانوں
کو کسی نئے پیرو گرام کی طرف توجہ نہیں دلاتے ہیں بلکہ حضرت
مسیح موعود علیہ السلام کے اس نقشہ کو جو آپ نے قادیان میں تیار
فرمایا تھا جیسا کہ یاد ہیں تو تحریک ان کے قلمی پردوں پہ دکھاتا

چاہتے ہیں مگر آسمانی اور زمینی داعیوں کی امتیازی حیثیت دو طرح واضح ہوجاتی ہے۔

اوّل :۔ یہ کہ قادیان کا تیار کردہ نقشہ محض نقشہ نہیں تھا بلکہ واقعات کی دُنیا میں اس کو عملی جامہ پہنانے والی ایک زبردست جماعت طوفان کی طرح آگے بڑھتی جارہی تھی۔ مگر یہاں صرف نقشہ ہی نقشہ تھا۔

دوم :۔ وہاں خود نقشے سے یہ آواز نکل کر فضائے آسمانی میں گونج رہی تھی کہ :۔

"وہی برکتیں اب بھی جوئندوں کے لئے مشہود ہوسکتی ہیں جس کا جی چاہے صدق دل سے رجوع کرے۔ کیا کوئی زمین کے اس سرے سے اُس سرے تک ایسا متنفس ہے کہ قرآن شریف کے اُن چمکتے ہوئے نوروں کا مقابلہ کرسکے۔ کوئی نہیں، ایک بھی نہیں۔" (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۱)

مگر یہاں وہ شخص جو اس نقشہ کی نقل (copy) کرکے دُنیا میں خدا اور اس کے دین کی صداقت کا سبق پڑھانے کیلئے گھر سے نکلا تھا زندہ خدا کی برکات کا چیلنج دینے کی بجائے یہ اعتراف کر رہا تھا کہ :۔

"ہم معاد اور کلام الٰہی حتّٰی کہ خود وجود و صفاتِ الٰہی کے متعلق بھی جن باتوں پر ایمان رکھتے ہیں ان پر ہمارا ایمان و یقین اس بنا پر نہیں کہ ہماری اپنی عقلی تحقیق یا ہمارے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ نے ان کے متعلق ہمیں کوئی ایسا قطعی اور یقینی علم بخشا ہے جس کے خلاف ہم پر کوئی دلیل عقلی قائم نہ کیجاسکتی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ نبوت کی بحث سے بے نیاز ہو کر اُن مسائل سے بحث کیجاسکتی تھی لیکن ان امور پر ہمارے قطعی ایمان و اذعان کی بُنیاد دراصل اس اعتقاد پر ہے کہ محمد صلعم صادق القول ہیں۔۔۔۔۔ (پس) جب تک محمد صلعم کی صداقت کے منکر ہم اس بنیادی مسئلہ کو تسلیم نہ کرالیں گے اس وقت تک کسی فرعی مسئلہ سے بحث ہی نہ کریں گے۔" (ترجمان القرآن جولائی ۱۹۳۴ء)

جماعتِ اسلامی کا بنیادی نقص

مودودی صاحب کے اس جواب کا ایک ایک لفظ اس بات پر گواہ تھا کہ آپ دُنیا کو جس مقدس ذات کی خبر دینے جارہے ہیں اس کا عملی مشاہدہ اور تجربہ کرنے میں آپ سراسر ناکام ہیں۔ اور اگر سچ پوچھئے تو احمدیت اور مودودی تحریک کا بنیادی اور اساسی فرق بھی یہی ہے کہ احمدیت ایک مادی تحریک نہیں بلکہ وحی والہام اور روحانی خلافت اس کے ضامن ہیں۔ مگر مودودی صاحب یہ اقرار کرتے ہوئے بھی کہ :۔

"اب تجدید کا کام نئی اجتہادی قوت کا طالب ہے۔ محض وہ اجتہادی بصیرت جو شاہ ولی اللہ صاحب یا اُن سے پہلے کے مجتہدین و مجددین کے کارناموں میں پائی جاتی ہے، اس وقت کام کو عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی نہیں۔" (تجدید احیائے دین صفحہ ۱۰۷ شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی پٹھانکوٹ)

اس بات کی جرأت نہیں کرسکتے کہ آپ کو مجددین کرام اور خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی طرح خدا سے تعلق اور کلام کا شرف حاصل ہے۔ حالانکہ یہ ایک کھُلی حقیقت ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے جس قدر

تجدیدی کارنامے سرانجام دیئے ان کی تمام تر بنیاد الہام اور دعویٰ امامت پر تھی ۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :-

”ولمّا تمّت بی دورة الحکمة البسني الله خلعة المجددية فعلمت علم الجميع بين المختلفات ۔“

”ومن نعم الله علیّ و لا فخر ان جعلنی ناطق هذه الدورة وكليهما قائد هذه الطبقة وزعيمها فنطق على لساني ونفث على نفسي ۔“

پھر فرماتے ہیں :-

”فهمني ربّي انا جعلناك امام هٰذه الطريقة وسددنا طريق الوصول الى حقيقة القرب كلها اليوم غير طريقة واحدة و هو محبتك والانقياد لك فالسماء ليس على من عاداك بسماءٍ و ليست الارض عليه بارضٍ فاهل الشرق والغرب كلّهم رعيتك وانت سلطانهم علموا اولم يعلموا فان علموا فازوا وان جهلوا خابوا ۔“ (بحوالہ تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد ایڈیشن دوم شائع کردہ کتابی دنیا صفحہ ۲۵۹)

اب واضح سوال یہ ہے کہ جب حضرت شاہ صاحب جیسے بلند پایہ مجدد اور ولی انسان اپنے الہامات و کشوف سمیت دنیا میں واپس آکر اسلامی انقلاب برپا نہیں کر سکتے تو جناب! آپ میں وہ کونسی روحانی قوت ہے کہ آپ الہام و کلام سے محروم ہوتے ہوئے مدینۃ الرسول کا سنگِ بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو سکیں گے ؟

انقلاب اسلامی کے قیام پر غور کرتے ہوئے کسی معمولی شخص کا ذہن اس قدر اہم اور ضروری سوال کو نظر انداز نہیں کر سکتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ مودودی صاحب کا دماغ اسے فراموش کر دیتا ۔ چنانچہ حقیقت بھی یہی ہے کہ مودودی صاحب ابتدائے تحریک سے ہی اس معمہ کو حل کرنے میں مصروف تھے ۔ اور خصوصاً جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ تو خاص انہی مسائل میں گذر رہا تھا ۔ مگر عجیب بات ہے کہ مودودی صاحب کو جہاں دیگر مسائل میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تقلید کا ڈھنگ خوب مستحضر رہتا تھا وہاں اس مرحلہ پر آپ کچھ سوچنے سے پہلے ہی سب کچھ بھول جاتے تھے اور گھبرا کر مختلف بولیاں بولنی شروع کر دیتے تھے کبھی فرماتے :-

”یہ بات آپ سمجھ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ خود تو آپکے سامنے آکر حکم دینے سے قاصر رہا ۔ اس کو جو کچھ احکام دینے تھے وہ اس نے اپنے رسول کے ذریعہ سے بھیج دیئے ․․․․ ․․․․ حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ساڑھے تیرہ سو برس پہلے وفات پا چکے ہیں آپ کے ذریعہ جو احکام خدا نے دیئے تھے وہ قرآن اور حدیث میں ہیں لیکن قرآن اور حدیث خود چلنے پھرنے اور بولنے اور حکم دینے والی چیزیں نہیں کہ آپ کے سامنے آئیں اور کسی بات کا حکم دیں اور کسی بات سے روکیں ۔ قرآن اور حدیث کے احکام کے مطابق آپ کو چلانے والے بہرحال انسان

ملاحظہ ہو [illegible] ”[illegible]“ کا مضمون [illegible]

ہی ہوں گے۔ اسلئے انسانوں کی اطاعت کے بغیر تو چارہ نہیں۔ البتہ ضرورت جس بات کی ہے وہ یہ ہے کہ آپ انسان کے پیچھے آنکھیں بند کرکے نہ چلیں ۔۔۔۔۔ اور اگر قرآن و حدیث کے مطابق چلائیں تو ان کی اطاعت آپ پر فرض ہے" (خطبات بار ہفتم ص۲ مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان)

کسی وقت کہتے :۔

"دین کو ہر دور میں ایسی طاقتور شخصیتوں کی ضرورت تھی اور ہے جو زمانہ کی بگڑی ہوئی رفتار کو بدل کر پھر سے اسلام کی طرف پھیر دیتی رہیں ان کا نام مجدد ہے" (تجدید و احیائے دین ص۲۷)

بعض اوقات مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتلاتے :۔

"اب ذرا اس قوم کی حالت پر نظر ڈالئے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ نفاق اور بدعقیدگی کی کونسی قسم ایسی ہے جس کا انسان تصور کر سکتا ہے اور وہ مسلمانوں میں موجود نہ ہو" (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۴ء بحوالہ خطبات ص۱۱)

غرضیکہ سیدھی سادھی باتوں کو چھوڑ کر آپ کوئی معقول جواب دینے کی بجائے اشاروں سے الجھے رہتے تھے۔ اور "خشد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" کے مصداق بن کر یہ نہ بتا سکتے تھے کہ آپ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ اور بتا بھی کیسے سکتے جبکہ آپ مجدد کے خصائص، مہدویت کے نشانات اور نبوت کی برکات سے بالکل تہی دامن تھے۔ اور اسکے باوجود ان کی شدید خواہش تھی کہ کوئی ایسی ترکیب نکل آئے کہ کچھ نہ ہونے کے باوجود آپ سب کچھ کہلائیں۔ آخر ہزار سوچ اور فکر کے بعد آپ نے ۱۹۳۹ء کے آخر میں "الفرقان بریلی کے شاہ ولی اللہ" نمبر میں مجددین کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے مہدی موعود کے متعلق "اپنا اندازہ" یہ ظاہر کر دیا کہ "مجھے اس کے کام میں کرامات و خوارق، کشوف و الہامات اور چلوں اور مجاہدوں کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔" اور اس کے ساتھ ہی آپ نے چند ایسی علامات بھی اختراع کر لیں جنہیں آپ کا منصد بڑی آسانی سے آپ پر چسپاں کر سکے ؎

قرارداد پاکستان اور مودودی صاحب

مودودی صاحب کے اس "تجددانہ" کارنامے کے چند ماہ بعد قائد اعظم کی صدارت میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو پاکستان کی تاریخی قرارداد پاس کی گئی اور مسلمان پاکستان کی خاطر متحد ہونے شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کے اس اتفاق اور اتحاد میں اپنی آرزوؤں کا خون ہوتے دیکھ کر آپ نے ۱۲ ردسمبر ۱۹۴۰ء کو علیگڑھ میں بڑی لمبی چوڑی تقریر کی جس میں پہلے تو مودودی صاحب نے یہ کہا کہ اسلامی حکومت آجکل بازیچۂ اطفال سمجھ لی گئی ہے حالانکہ جبتک ٹھوس سیرت اور بلند کردار رکھنے والی ایک سوسائٹی قائم نہ ہو اس وقت تک "محض معجزہ" کی بدولت کچھ نہیں ہو سکتا۔ پھر مسلمانوں کے متعلق کہا :۔

"یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر لوگوں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں موجود ہیں"

آخر میں آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پیدا شدہ انقلاب اسلامی کی وضاحت کرنے کے بعد کھلے بندوں وہ بات کہہ دی جسے اس قدر عریاں انداز

بیان پیش کرنے کی کبھی جرأت نہیں ہوتی تھی یعنی فرمایا:۔

"یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے یہی اس کا راستہ ہے۔ اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے اور اسی تدریج پر وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس کو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہہ دیتے ہیں کہ اب یہ کہاں ہو سکتا ہے۔ نبی ہی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ ہے اس میں علت اور معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط نظر آتا ہے۔ آج ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔" (اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے صفحہ ۳۹ جماعت اسلامی پاکستان)

کیا ان الفاظ کا صاف صاف مطلب نہیں تھا کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے نبوتوں اور معجزات کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ یہ صرف علت و معلول کے باہمی ربط کا ایک طبعی قسم کا واقعہ ہے۔ اور اگرچہ انہیں الہام و وحی کے کوچے سے آشنائی نہیں ہے تاہم انبیاء کی طرح انقلاب برپا کرنے کا سلیقہ ضرور رکھتے ہیں۔ گو اپنے تئیں نبی کے نام سے موسوم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ ہے وہ اصل چیلنج جس کو واقعات کی دنیا میں سچا ثابت کر دکھانے کے لئے آپ نے ماہ صفر ۱۳۶۰ھ کے پرچے میں ایک جماعت کی تشکیل کے لئے لاہور میں چند لوگوں کو جمع ہونے کی دعوت دی۔

جناب مودودی صاحب امیر جماعت اسلامی کی حیثیت میں

"جماعت اسلامی" کا قیام

ماہ صفر کی دعوت پر سید ابو الاعلیٰ صاحب

مودودی کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے کیونکہ اس سے قبل آپ صرف ترجمان القرآن کے ذریعہ سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نظریات کی تقلید کر رہے تھے۔ مگر مرکزیت اور امارت کے جن دو ضروری رکنوں سے آپ محروم تھے اس کے متعلق عملی اقدام کا وقت اب میسر ہوا تھا۔ چنانچہ آپ کی قبل از وقت دعوت پر ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں اجتماع ہوا جس میں آپ نے مدعو حضرات کے سامنے اپنی گذشتہ مساعی اور "ترجمان القرآن" کے مضامین کا تذکرہ کرنے کے بعد ایک "اسلامی جماعت" بنانے کی تجویز پیش کی اور اس تحریک کی امتیازی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:۔

۱۔ صرف ہماری جماعت پورے اسلام کو لیکر اٹھی ہے۔

۲۔ ہم اس ڈھنگ پر نظام جماعت بنا رہے ہیں جس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی جماعت تیار کی تھی۔

۳۔ ہمارے ہاں صرف وہ شخص بھرتی کیا جائے گا جو مقتضیات ایمان کو پورا کرے گا۔ اس طرح مسلمانوں میں سے صالح عنصر چھٹ کر جماعت میں آتا جائے گا اور جو جو صالح بنتا جائے گا اس جماعت میں داخل ہوتا جائے گا۔"

۴۔ "ہماری جماعت میں نہ صرف پیدائشی مسلمانوں کا صالح عنصر کھنچ کر آئے گا بلکہ نسلی غیر مسلموں میں بھی جو سعید روحیں ہیں وہ بھی اس عالمگیر تحریک

میں شامل ہوتی چلی جائیں گی۔"

"یہی خصوصیات ہیں جنکی بنا پر ہم
اس جماعت کو اسلامی جماعت اور اس
تحریک کو اسلامی تحریک کہتے ہیں۔"
(روداد حصہ اول صلا مکتبہ جماعت اسلامی)

"اسلامی تحریک" کے اصل مقام کے متعلق تبلایا:۔

"ہماری حیثیت اس جماعت کی سی نہیں
جو ابتداءً نبی کی قیادت میں بنتی ہے۔ بلکہ
ہماری صحیح حیثیت اس جماعت کی ہے جو
اصل نظام کے درہم برہم ہوجانے کے بعد
اس کو تازہ کرتی ہے۔" (روداد حصہ اول صفحہ)

اس کے بعد جناب مودودی صاحب نے کلمہ شہادت پڑھا اور کہا کہ:۔

"لوگو گواہ رہو کہ میں آج ازسرِ نو ایمان
لاتا اور جماعت اسلامی میں شریک ہوتا ہوں۔"

اس کے بعد مولوی محمد منظور صاحب نعمانی نے بھی تجدید ایمان کا اعلان کیا اور مودودی صاحب نے فرمایا:۔

"ہر شخص کو قدم آگے بڑھانے سے پہلے
خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کس خارزار میں
قدم رکھ رہا ہے۔ اور یہ وہ راستہ نہیں
ہے جس میں آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹ جانا
دونوں یکساں ہوں۔ یہاں پیچھے ہٹنے کے
معنے ارتداد کے ہیں۔" (روداد صفحہ)

نیز فرمایا:۔

"اسلام بغیر جماعت کے نہیں اور جماعت
بغیر امارت کے نہیں۔"

اس پر حاضرین کی طرف سے آپ کو امیر منتخب کر لیا گیا اور آپنے مسندِ "امامت" پر آنے کے بعد بڑے فخر سے یہ بات کہی:۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ وہ تحریک
ہے جس کی قیادت اولوالعزم
پیغمبروں نے کی ہے۔" (روداد صلا)

اس موقع پر جماعت میں شعبہ علمی، شعبہ نشر و اشاعت، شعبہ تنظیم جماعت، شعبہ مالیات اور شعبہ دعوۃ و تبلیغ کا قیام بھی عمل میں آیا اور مودودی صاحب نے امیر ہونے کی حیثیت سے جو ہدایات دیں ان کا خلاصہ یہ تھا۔

نو مبایعین کو ازسرِ نو کلمہ شہادت پڑھایا جائے۔ قرآن کا درس ہو۔ تعلق باللہ پیدا کیا جائے۔ ہنگامہ آرائی سے اجتناب کیجئے۔ مقرر پہلے انداز تقریر کو بدلیں اور اراکین الیکشن اور اسمبلیوں سے کنارہ کش رہیں۔ اور تبلیغ میں دردمندانہ لہجہ اختیار کیا جائے۔

مودودی صاحب نے اپنی تحریک کے آغاز پر جو خصوصیات بیان کی ہیں اور جس قسم کی ہدایات اپنی جماعت کو دی ہیں ان کے بعض حصوں کو اگر حذف کر دیا جائے تو بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ جماعت احمدیہ کی تاریخ کا ایک ورق دُہرایا جا رہا ہے۔

ضلع گورداسپور میں جدید مرکز

المختصر مودودی صاحب ایک خود ساختہ جماعت کے امیر بن گئے مگر ان کے پیرو ابھی تک لامرکزیت کی حالت میں تھے۔ لہذا فروری ۱۹۴۲ء میں ایک عارضی مرکز کی تجویز پاس کی گئی۔ اور چوہدری نیاز علی صاحب[1] آف جمال پور نے اس سلسلہ میں اپنی زمین جماعت کو دیدی اور آخر مودودی صاحب ۱۵ ؍جون ۱۹۴۲ء کو اس نئے مرکز میں تشریف لے آئے۔ خدا تعالیٰ کی یہ عجیب شان ہے کہ مودودی صاحب کا یہ مرکز بھی اسی ضلع میں تھا

[1] یہ صاحب بعد میں مولانا صاحب سے بدظن ہو کر کنارہ کش ہو گئے تھے۔

جس میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا مرکز ترپن سال
سے قائم تھا۔ اور اسلامی حکومت کو قائم کرنے کی تنہا
کوششیں کر رہا تھا۔ اور جس سے خود مودودی صاحب
دلی اور حیدر آباد بیٹھے ہوئے فائدہ بھی اٹھا چکے تھے۔
مودودی صاحب چاہتے تو اس روشنی کے
مینار سے اپنے خانۂ دل کو حقیقی معنوں میں منور کر سکتے
تھے۔ مگر افسوس انہوں نے خدائی مرکز کی طرف
نگاہ ڈالنا بھی جرم سمجھا اور ایک قطعہ زمین کو
"دارالاسلام" کے نام سے موسوم کر کے یہ اعلان
کر دیا:۔

"بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان
میں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں اسلامی
قانون بغیر کسی منع و مزاحمت کے نافذ
ہو ..... اور ہندوستان کے وسیع
و عریض براعظم میں زمین کا ایک انچ بھر
ٹکڑا ایسا تلاش کر سکیں جو اس نظام
کے اثر سے ماؤف نہ ہو۔ تاہم گورداسپور
کے ضلع میں قصبہ پٹھانکوٹ کے قریب
زمین کے ایک ٹکڑے کو دارالاسلام
بنایا جاتا ہے۔ اور اس شیطانی نظام
کے باوجود اس کے اندر دارالاسلام
موجود ہے۔" (ترجمان القرآن
فروری ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۴۷)

اس اعلان پر ایک عجیب لطیفہ ہوا کہ ان کے کسی
رفیق جماعت نے اپنے رشتہ داروں سے تنگ
آکر "دارالاسلام" میں آنے کی درخواست کی۔
مولانا صاحب گھبرا اٹھے کہ اس طرح "مہاجرین" کی
ایک بڑی فوج کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ یہ خیال
آتے ہی آپ نے رسالہ میں یہ اعلان شائع فرما دیا:۔

"ہمارے پاس نہ جگہ ہے نہ ذرائع
نہ صحیح معنوں میں ایسا کوئی دارالاسلام
بن گیا ہے جس کی طرف دارالکفر سے
ہجرت کرنا ضروری ہو اور نہ اصولاً
یہ صحیح ہے کہ ملکی زندگی کی بھٹی سے
اچھی طرح گذرے بغیر لوگ مجرد عقیدہ
ونصب العین قبول کر کے کسی ایک مقام
پر جمع ہونے لگیں۔" (رسائل و مسائل صفحہ ۴۹
مکتبہ مرکزی جماعت اسلامی)

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ میں یہ بتا رہا تھا کہ مودودی
صاحب نے قادیان کے قریب جمالپور میں اپنا مرکز
قائم کر لیا۔ اور بظاہر جماعت احمدیہ کی طرح ایک
امیر اور مرکز رکھنے والی جماعت کا قیام ہو گیا۔
مودودی صاحب اپنی امارت اور جمالپور کی
مرکزیت پر بے حد نازاں ہو رہے تھے کہ آپ کی
نام نہاد امارت اور ان کی جماعت پر قدرت نے
ایک کاری ضرب لگائی کہ آپ کی امارت کے تھوڑے
ہی عرصے بعد "اسلامی جماعت" میں ایک خوفناک
انتشار پیدا ہو گیا اور اندرونی اختلافات اس
درجہ بڑھ گئے کہ مودودی صاحب کو ان کے دور
کرنے کے لئے نومبر ۱۹۴۲ء میں دہلی میں مجلس شوریٰ
کا ایک ہنگامی اجلاس بلانا پڑا۔ مودودی صاحب
اس اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے
ہیں:۔

"مجلس شوریٰ کے انعقاد کی اصل
غرض چند ایسے اختلافات کا حل تلاش
کرنا تھا جو بدقسمتی سے ابتدائی مراحل
میں اس نازک موقع پر نظام جماعت کے
اندر رونما ہو گئے تھے اور جن کی وجہ

یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اقامتِ دین کی منظم کوشش جو ایک صدی کے تعطل کے بعد پھر بشکل شروع ہوئی ہے شروع ہوتے ہی ختم ہو جائے۔" (رسالہ ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۴۲ء صفحہ ۲۰۲)

میں خود استعفٰی دیتا ہوں

بہرحال "اقامتِ دین" کی تحریک کے امیر اور اس کے "صالح" کارکن دلّی میں جمع ہوئے تو اصل حقیقت یہ نکلی کہ آپ کی جماعت میں سے ایک تعلیم یافتہ عنصر آپ کے خلاف سخت بے اطمینان ہو کر خفیہ خفیہ الزامات جوڑ رہا تھا۔ اس انتشار کو دُور کرنے کیلئے مودودی صاحب نے جو تین متبادل صورتیں پیش کیں ان سے خود تراشیدہ جماعتوں اور امامتوں کی قلعی خوب کھل جاتی ہے اور ایک خدا ترس انسان اگر اس تحریک کی پوری تاریخ میں سے صرف اس واقعہ پر غور کرے تو اسے زندہ خدا کی زندہ تجلی نظر آ سکتی ہے اور وہ احمدیت کے مقابل اس نئی تحریک کا موقف خود بخود سمجھ سکتا ہے۔ یہ تین متبادل صورتیں کیا تھیں؟ خود مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

"میں نے جماعت کے سامنے تین متبادل صورتیں پیش کیں۔

۱- میں خود استعفٰی دیتا ہوں میری جگہ کسی اور کو منتخب کریں۔

۲- تین چار رکن اس منصب کو سنبھال لیں۔

۳- جماعت کا یہ نظام جو ہم نے بنایا ہے اسے توڑ دیا جائے۔ اور ان سب لوگوں کو جو اس نصب العین کی خدمت کا عہد کر چکے ہیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس شخص کا جس پر اطمینان ہو اس سے وابستہ ہو کر کام کرے اور جو لوگ کسی دوسرے سے بھی مطمئن نہ ہوں مگر خود اپنے اوپر اطمینان رکھتے ہوں وہ خود اٹھیں اور کام کریں اور جو لوگ دوسروں سے بھی مایوس ہوں اور اپنے آپ سے بھی وہ پھر امام مہدی کے ظہور کا انتظار کریں۔

پہلی تجویز رد کر دی گئی۔ دوسری تجویز بھی بالاتفاق رد کر دی گئی۔ کیونکہ نہ وہ شرعاً صحیح ہے اور نہ عملاً بلکہ ہمارے مقصد کے لئے مضر رہی تیسری تجویز، تو اختلاف رکھنے والے اصحاب کی خواہش یہی تھی اور میں بھی اس طرف مائل تھا۔ کیونکہ میں ایسے مختلف المزاج عناصر کے اجتماع میں کوئی خیر نہ دیکھتا تھا جو ترکیب و امتزاج قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں اور ان کم سے کم ضروری حفاظت سے بھی عاری ہوں جن کے بغیر کوئی کارکن جماعت نہیں بن سکتی۔" (ایضاً دسمبر ۱۹۴۲ء)

چند ماہ کے بعد ہی یہ ستاؤ سال ——— کے بعد قائم ہونے والی تحریک سے مستعفی ہونا، تین چار اشخاص کو امیر بنانے کی غیر شرعی تجویز پیش کرنا، یا اسے بالکل توڑ دینے کی خواہش ظاہر کرنا مودودی صاحب کی اصل پوزیشن کو بالکل بے نقاب کر دیتا ہے۔ اسی طرح آپ کا کارکنوں سے بالکل اظہار مایوسی

بھی ایک مصنوعی قوتِ تنظیم و اجتہاد کا پتہ دیتا ہے کیونکہ دُنیا کی تاریخ میں مادّی تحریکات سے تو یہ استعفٰے اور الم دیاس کے مواقع پیش آجاتے ہیں مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ خدا تعالیٰ کے قائم کردہ ماموروں نے بھی کبھی مایوس ہو کر استعفٰے پیش کر دیا ہو۔

"صالحیت" کے نفوذ کا انوکھا طریق

دہلی کی شوریٰ کے چار ماہ بعد جالیور میں اجتماع ہوا جس میں مودودی صاحب نے پھر اس بیماری کا ذکر کرتے ہوئے کہا :۔

"ہماری انتہائی احتیاط کے باوجود ایک اچھی خاصی جماعت ہمارے نظام میں ایسی داخل ہوگئی ہے جسے فی الواقع اس کام سے کوئی گہری دلچسپی نہیں۔" (رودادِ جماعت اسلامی حصہ دوم ص۲)

"بہت سے ارکان ایسے بھی ہیں جو جماعت میں داخل ہونے کے بعد بھی ویسے ہی ٹھنڈے بے روح اور جامد و ساکت ہیں جیسے اس سے پہلے تھے۔" (ایضاً ص۳)

"چند اصحاب کے اندر گناہوں کی کثرت کا یہ حال دیکھ رہا ہوں کہ نماز تک کے تارک ہوگئے ہیں۔ جن تمام چیزوں سے پرہیز کرنے لگے تھے ان میں پہلے سے بھی کچھ زیادہ مبتلا ہو رہے ہیں۔" (ایضاً ص۹)

"اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ پچھلے دو سال کے دوران میں متعدد اصحاب ہمارے نظامِ جماعت سے الگ ہوئے ہیں اور چند مستثنیات کے سوا تقریباً سب کے اندر اس علیحدگی نے رجعت قہقری اختیار کر لی ہے۔" (ایضاً ص۳)

اس افسوسناک حالت کو دیکھ کر جماعت اسلامی نے یہ انوکھا حل سوچا کہ یہ خرابی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ہم نے اپنی تحریک میں غیر صالح لوگوں کو بھی بھرتی کر لیا ہے اسلئے سب سے پہلے تو ان کی چیکنگ کی گئی اور جو پیش حضرات سے کہا گیا کہ جماعت سے الگ ہو کر اصلاح کریں۔ اسکے علاوہ نئے آنے والوں کے ٹیسٹ (Test) میں خاصی سختی شروع کر دی گئی۔ یعنی دیکھا جانے لگا کہ امیدوار نے لٹریچر کا پورا مطالعہ کر لیا ہے۔ اس پر نمایاں اثر بھی معلوم ہوتا ہے یا نہیں۔ عملاً اس کام کے لئے بے چین بھی رہتا ہے یا نہیں۔ پھر گیارہ معین سوالات اس کے سامنے پیش کئے جاتے۔ اگر جوابات صحیح ہوتے تو انہیں امیدواری کی حالت میں رکھا جاتا اور کہا جاتا کہ وہ اپنے تئیں جماعت کا کارکن سمجھتے ہوئے کچھ مدت کام کرے۔ اس طرح اسکے کام کی تفتیش (Inspection) کرنے کے بعد انہیں رکن بنانے کی اجازت ملتی تھی۔ (رودادِ جماعت اسلامی حصہ سوم ص۱۴ و ترجمان القرآن مئی ۱۹۴۶ء)

جماعتِ اسلامی نے "معیارِ صالحیت" کا جو ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ دُنیا داروں کی سوسائٹی میں تو مل سکتا ہے مگر خدا تعالیٰ کی جماعتوں میں کہیں نہیں ملے گا۔ اس کے برعکس ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ انبیاء اور ان کے جانشین حزب اللہ میں شامل کرنے کے لئے کوئی پابندی عائد نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ہر صاحبِ اخلاق انسان کے لئے ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ مگر چونکہ مودودی صاحب خود تو "صالحیت" کے پیدا کرنے اور کمزور اور ناقص مسلمانوں کو سچا اور پکا مسلمان بنانے سے قاصر تھے اور ان کے رفقاء بھی اس قسم کے انقلاب کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اسلئے انہیں یا نیا پیمانۂ فکر

اختیار کرنا پڑتا تھا کہ جماعتِ اسلامی میں کوئی "غیر صالح" شخص لیا ہی نہ جائے اور آنے والوں کی بھی سالانہ چھان بین کی جائے۔ جماعت اسلامی کے قیّم میاں محمد طفیل صاحب نے اس ضمن میں لکھا تھا :-

"اس وقت چونکہ جماعت کی بنیادیں
بہت پائیدار اٹھانی ہیں اس لئے ان
پابندیوں کی شدید ضرورت ہے۔"
(ترجمان القرآن مئی ۱۹۳۶ء صفحہ ۳۳)

اگر اس طریقہ سے ہی کچھ تبدیلی ہو جاتی تو اس "اقامتِ دین" کی تحریک کو صحیح سمجھے جانے کی ایک راہ پیدا ہو سکتی تھی۔ مگر مودودی تحریک کے اوراق سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ابتدا سے داخلے کی خاص شرائط رکھی گئیں اور صرف چند لوگ ساتھ تھے اور بعد کو ان قیود میں غالیانہ حد تک اضافہ بھی ہوتا چلا گیا۔ مگر اس قدر غیر معمولی احتیاط کے بعد مودودی صاحب ایک طرف تو یہ فرماتے تھے :-

"ہمارے پیشِ نظر صرف ایک سیاسی
نظام کا قیام نہیں ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ
پوری انسانی زندگی انفرادی و اجتماعی
میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام
رونما کرنا چاہتا ہے اور جس کے لئے
اللہ نے اپنے انبیاء کو مبعوث کیا
ہے۔" (رودادِ جماعت اسلامی حصہ سوم صفحہ ۳)

اور دوسری طرف آپ بالفاظِ ذیل یہ فرماتے تھے کہ:-

۱۔ "(جماعت کے) لوگوں نے ابھی تک اس بات
کو پورے طور پر سمجھا ہی نہیں کہ دین حقیقت
میں کس چیز کا نام ہے۔" (دعوتِ اسلامی اور
اس کے مطالبات صفحہ ۵۳)

۲۔ "ایک اور خاص بات جو ہمارے بعض رفقاء
میں پائی جاتی ہے اور جو اکثر ہمارے لئے
سبب پریشانی بنتی رہتی ہے کہ یہ حضرات
اصول اور مقصد اور نظریئے کی حد تک
تو اس جماعت کے مسلک کو سمجھ گئے ہیں۔
لیکن طریق کار کو ابھی طرح نہیں سمجھ سکے۔"
(دعوت اسلامی صفحہ ۵۳)

۳۔ "بعض حضرات نے تو ستم ہی کر دیا کہ جب
ہماری طرف سے اُن کو ٹوکا گیا تو انہوں نے
ہمیں اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ نام
آپ ہی کا لیا جائے گا ...... گویا ان کے
نزدیک ہماری ساری تگ و دو رجسٹرڈ
ٹریڈ مارک چلانے کے لئے ہے۔ اور لطف
یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ ہیں۔
ہماری جماعت کی بعض مقامی شاخیں اس
دباؤ سے خاص طور پر بہت زیادہ متاثر ہیں۔"
(دعوت اسلامی صفحہ ۱۱)

"ہمارے حلقۂ رفقاء میں ایک اچھا خاصا
گروہ ایسا پایا جاتا ہے جس نے تبلیغ و اصلاح
کے کام میں تشدد اور سخت گیری کا رنگ
اختیار کر لیا ہے ...... میں ایسا محسوس
کرتا ہوں کہ ان کے اندر بگڑے ہوئے
لوگوں کو سزا دینے کی بے تابی اتنی زیادہ
نہیں ہے جتنی انہیں اپنے سے کاٹ پھینکنے
کی بے تابی ہے۔" (ایضاً صفحہ ۳)

اس ناکام قیادت کے نقوش کی روشنی میں مولانا مودودی صاحب کا یہ دعویٰ کس قدر عجیب معلوم ہوتا ہے :-

"اس دعوت کو عملاً لیکر اٹھنے، اسے
اپنے دوسرے بھائیوں تک پہنچانے اور

اس سے متاثر حضرات کو سمیٹنے اور جذب کرنے کا صحیح طریقہ یقیناً وہی ہو سکتا ہے جو ابتدا سے آخر تک اس دعوت کے اصل علمبردار یعنی انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں اختیار کرتے رہے ہے۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ وہ طریقہ کار ایک ہی ہے اور وہی طریقہ ..... ہر زمانے میں اختیار کیا جاتا رہا ہے چنانچہ اس طریق کار کو ہم نے اختیار کیا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ اس ایک دعوت اور طریق کار کے علاوہ دوسری تمام دعوتیں اور طریقہ ہائے کار سراسر باطل ہیں۔"

(روداد جماعت اسلامی حصہ سوم ص۱۱)

اسلامی تقویٰ کی دلچسپ مثال

مودودی صاحب نے ان دنوں اپنی جماعت میں تقویٰ اور خدا ترسی کی ایک دلچسپ مثال پیش کی تھی۔ چونکہ یہ مثال آپ کے معیار صالحیت کو بھی واضح کرتی ہے اور معتقدین کی شانِ اقتدار کو بھی۔ لہٰذا ہم یہ مثال خود آپ ہی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں:-

"حال کی بات ہے کہ ہمارے ایک رفیق جو ملازم ہیں ایم۔ اے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس تیاری کے دوران میں انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے ذہن میں اپنی طاغوتی ملازمت میں ترقی اور بڑے گریڈوں کے خیالات آنے شروع ہو گئے ہیں جو ناجائز اور ایمان کی عین ضد ہیں۔ چنانچہ اس اللہ کے بندے نے اس بنا پر امتحان کا خیال ہی ترک کر دیا ...

..... یہ ایک واقعہ میں نے مثال کے طور پر عرض کیا ہے ورنہ خدا کے فضل سے اب ہمارے ارکان میں صحیح اسلامی تقویٰ پیدا ہو رہا ہے۔" (ایضاً ۱۹۴۵ء، ص۲۱)

ارکان جماعت امیر اور قیم کی نظر میں

"اسلامی تقویٰ" کی پیدائش پر مزید تبصرہ کیے بغیر آگے چلتے ہیں تو ہمیں اس سے بھی پُرلطف صورتِ حال نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اپریل ۱۹۴۷ء میں قیم جماعت جناب محمد طفیل صاحب نے اپنی سالانہ رپورٹ پڑھتے ہوئے یہ اعلان فرمایا:-

"اس سال ہم نے جماعت کو کمزور اور ناقابلِ اطمینان ارکان سے تقریباً کلیۃً پاک کر دیا ہے۔" (روداد حصہ پنجم ص۳۰)

قیم جماعت اپنی طرف سے تو ایک خوش کن رپورٹ کے ذریعہ "تحریک اسلامی" کے خلاف غالباً اُن لوگوں کے سوالات کا جواب لکھ کر لائے تھے جنہیں اس وقت تک جناب مودودی صاحب کی جماعت میں کوئی "صالح انقلاب" نظر نہ آتا تھا۔ مگر یہ بات چونکہ محض تصنع اور بناوٹ سے پیدا کی گئی تھی اسلئے مودودی صاحب کی زبان سے اس موقع پر یہ صداقت جاری ہو گئی کہ:-

"میں بعض ارکان میں احساسِ ذمہ داری اور سرگرمی کم پاتا ہوں۔" "اس حلقے کے ارکان اور ہمدردوں میں باہمی تعاون بھی کم پایا جاتا ہے۔" "بعض مقامات پر جماعتیں مُردہ ہو گئیں اور ہمیں اس کا پتہ بھی نہ چلا۔"

(روداد حصہ پنجم ص۱۶)

مودودی صاحب کے بیان میں حلقوں اور جماعتوں کے لفظ سے بظاہر یہ اثر پڑتا ہے کہ مودودی صاحب کی قیادت میں اس وقت بکثرت جماعتیں پیدا ہو چکی تھیں اور ارکان کی ایک کثیر تعداد آپ کے شریک کار ہو چکی تھی۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ قیم جماعت کی رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں آپ کے متبعین کی تعداد حسب ذیل تھی:-

صوبہ	تعداد	صوبہ	تعداد
۱- پنجاب	۲۶۳	۸- بمبئی	۱۱
۲- یوپی	۹۵	۹- بنگال	۸
۳- حیدرآباد	۲۹	۱۰- راجپوتانہ	۸
۴- مدراس	۳۵	۱۱- وسط ہند	۷
۵- سرحد	۲۳	۱۲- میسور	۴
۶- دہلی	۱۷	۱۳- انگلستان	۱
۷- سندھ	۱۱	کل تعداد =	۵۴۳

اِن ۵۴۳ ارکان کے ساتھ ہمدردان اور متاثرین کا ایک طبقہ بھی تھا۔ لیکن ایسے لوگ ہر تحریک کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اور کوئی جماعت اپنے کسی عملی پروگرام میں انکو قابلِ اعتماد حیثیت نہیں دے سکتی۔ پس "جماعتِ اسلامی" کی ساری کائنات بس یہی تھی۔ اور اس قدر قلیل التعداد کو کڑی شرائط سے مقید کرتے ہوئے بھی عجیب حالت ہو رہی تھی مگر دعاوی کا بازار تھا کہ سرد ہونے میں نہ آتا تھا۔

مسلمانانِ ہند کی سیاسی کشمکش اور مودودی صاحب

یہ تو مودودی صاحب کے وہ کارنامے ہیں جو آپ نے اپنی جماعت کی اصلاح اور تربیت کے لئے دکھائے تھے۔ لیکن دیگر مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کے سلسلہ میں جو کچھ کیا وہ اس سے بھی زیادہ تشویشناک ہے۔

اِس موقع پر یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ قراردادِ پاکستان کے بعد قیامِ پاکستان کا سات سال وقفہ مسلمانوں کی سیاسی کشمکش اور آزادی کی جنگ کا زمانہ تھا۔ انگریز اور ہندو کی بے پناہ طاقت مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے امڈی چلی آ رہی تھی۔ اور اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ مسلمان متفق اور متحد ہوں اور ہندو اور انگریز کی غلامی سے آزاد ہو کر زندگی بسر کرنیکا کوئی سامان کریں۔ اِس ذکر سے قطع نظر کہ جماعت احمدیہ نے تحریک خلافت، تحریک ہجرت، عدم موالات، ارتداد ملکانہ، سائمن کمیشن، نہرو رپورٹ، گول میز کانفرنس، کشمیر موومنٹ، غرضیکہ ہر نازک مرحلہ پر مسلمانوں کے ساتھ کیا تعاون کیا۔ ان کے سیاسی اور ملی تحفظ کے لئے کتنی سرگرمی دکھائی۔ اور اس نازک دور میں اپنی گذشتہ روایات سے کتنا بڑھ کر قیامِ پاکستان کی جنگ میں حصہ لیا۔ مسلم لیگ کی کیسی مدد کی۔ باؤنڈری کمیشن میں کیسا ہاتھ بٹایا اور پاکستان کے حق میں ووٹ دلوانے میں کتنی سعی کی۔ ہم یہ بتاتے ہیں کہ اس کے برعکس جناب ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی نے ۱۹۴۲ء سے ہی قیامِ پاکستان کو قوم پرستانہ تحریک قرار دیکر اپنے توپخانے کا رُخ اس کی طرف پھیر دیا اور اپنی تمام تر توجہات مسلم لیگ کے پروگرام کو درہم برہم کرنے میں مبذول کرنی شروع کر دیں۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں جب پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالنے کی نوبت آئی تو آپ نے اس سے گریز کرنے کے لئے ایک عجیب بہانہ تراش لیا۔ یعنی فرمایا:-

> "ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہمارا پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور انکا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو بہرحال ایک با اصول جماعت ہونیکی حیثیت سے ہمارے لئے یہ نا ممکن ہے کہ وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کریں جن پر ہم ایمان لائے۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ نظام حاکمیت جمہور پر قائم ہوا ہے ...
> .... بخلاف اسکے ہمارے عقیدۂ توحید کا

بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کی
نہیں بلکہ خدا کی ہو" (کوثر ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء)
پاکستان کی سکیم کو "اسلامی نظام" کے قیام کے لئے
بالکل ناموافق قرار دیتے ہوئے لکھا :-

"مسلمانوں میں عموماً شعورِ اسلامی
مُردہ یا نیم مُردہ ہو گیا ہے۔ ان کے اندر
اسلامی دستورِ حیات پر اور اس کے لئے
جینے اور مرنے کا ارادہ مفقود یا فقدان کی
حد تک ضعیف ہے۔ اور انہوں نے ہندوستان
کے غیر مسلم باشندوں کو صحیح نظامِ زندگی سمجھانے
اور اس کی طرف دعوت دینے کی کوئی کوشش
نہیں کی۔ اس وجہ سے مسلمانوں کی اپنی زندگی
بھی فکری، اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بیشتر
غیر اسلامی ہو گئی ہے اور ہندوستان کا پورا
نظامِ تمدن و سیاست بھی کافرانہ اصولوں
پر قائم ہوا ہے۔ اب اس خرابی کا اور اس
کے بُرے نتائج کا مداوا کرنے کے لئے اس
قسم کی تدابیر سے کچھ کام نہیں چل سکتا۔ کہ
اس کافرانہ نظام کی مشینری میں ہم چند نیک
مومنوں کو بھجوانے کی کوشش کریں .....
..... جمہوری نظام میں کوئی گروہ اپنے
اصول کے مطابق نظامِ حکومت کو اس
وقت تک ہرگز نہیں چلا سکتا جب تک کہ
وہ حکومت کی مشینری پر قابض نہ ہو ....
.... حکومت کی مشینری پر قابض ہونے کیلئے
ضروری ہے کہ مجالسِ قانون ساز میں اکثریت
حاصل ہو۔

اس غالب اکثریت کا حصول بحالاتِ
موجودہ ہندوستان کے ایک بڑے حصے
میں اہلِ ایمان کے لئے ممکن نہیں .....
..... فی الحال تو اسلام ہندوستان کی ایک
ایسی قوم کا مذہب ہے جس کی دوسری قوموں
سے کشمکش ہو رہی ہے ..... اور معلوم ہے
کہ یہ قوم ملک کے بڑے حصے میں بجائے خود اقلیت
میں ہے۔ رہے وہ علاقے جہاں مسلمانوں کو
اکثریت حاصل ہے تو اگر بالفرض وہ پاکستان
کی صورت میں خود مختار ہو جائیں اور ایک
مستقل صاحبِ حاکمیت اسٹیٹ کی تاسیس
بھی ان کو حاصل ہو جائے تب بھی خالص
اسلامی اصولوں پر جو گروہ کام کرنا
چاہتا ہے اس کی غالب اکثریت حاصل
کرنے کا بحالتِ موجودہ یہاں بھی امکان
نہیں۔ کیونکہ ان کی اکثریت حاصل کرنے کا
تمام تر انحصار مسلمانوں کی رائے عام پر ہے
اور مسلمانوں کی رائے عام اس وقت تک
بالکل ناتربیت یافتہ ہے۔ اسلامی فہم
..... و شعور سے بہت بڑی حد تک عاری
ہے اور اسلامی مقاصد کی بہ نسبت اپنی دنیوی
خواہشات و اغراض کے عشق میں بُری طرح
مبتلا ہے .....

پھر اگر بالفرض ایسا ایک گروہ اکثریت
میں منتخب ہو بھی جائے تو جو حالات اسوقت
پائے جاتے ہیں ان میں یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ
آزاد پاکستان کے نظام کو اسلامی دستور
میں تبدیل کیا جا سکے۔ کیونکہ جنت الحمقاء
میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ
کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن
آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بن بھی گیا تو)

لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر
بنے گا جس میں غیر مسلم اس طرح برابر کے
شریک حکومت ہوں گے جس طرح مسلمان"
(ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۶ء صفحہ ۴۴)

۱۹۴۶ء میں منزل مقصود

طبعاً سوال پیدا ہوتا تھا کہ ان حالات میں مودودی صاحب کیا مسلک اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کا جواب آپ نے ان الفاظ میں دیا ہے۔

"ہمارا مختصراً پروگرام یہ ہے کہ۔
(الف) مسلمانوں کے اس مخلوط انبوہ میں سے صالح اہل ایمان کے عنصر کو چھانٹ کر اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تربیت کے ساتھ منظم کیا جائے
. . . . . .
(ب) اس گروہ کے ذریعہ سے عام مسلمین میں اسلامی شعور و فہم اور اسلام اور غیر اسلام کی تمیز پیدا کی جائے ۔۔۔ . . . . اور ان کی رائے عامہ کو اس حد تک تیار کر دیا جائے کہ اگر جمہوری طریقوں پر ملک میں انقلاب کرنا ممکن ہو تو خالص اسلامی طرز پر کام کرنیوالی جماعت کے سوا کوئی دوسرا گروہ انہیں بیوقوف بنا کر یا ان کے سامنے غیر اسلامی مقاصد پیش کر کے ان سے ووٹ نہ حاصل کر سکے۔ اور اگر جمہوری طریقے قابلِ عمل نہ ہوں تو وہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہو جائیں ۔۔۔ . . .
. . . غیر مسلموں کے سامنے اسلامی نظامِ زندگی اور ان اخلاقی بنیادوں کو جن پر نظامِ زندگی قائم ہوتا ہے پیش کیا جائے اور پوری حکمت اور جانفشانی اور خالص للّٰہیت کے ساتھ ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن میں . . . . اسلامی نظام کا قیام صرف موجودہ مسلمان قوم کی رائے عام پر منحصر نہ ہے بلکہ اُن قوموں کی رائے عامہ بھی اس کی مؤید ہو جائے . . . .

اس پروگرام میں جب ہم ایک قابلِ لحاظ حد تک کامیاب ہو جائیں گے تب ہم ملک کے حالات پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ آیا اس وقت جمہوریت اتنی ترقی کر چکی ہے کہ دستورِ حکومت میں کوئی اصولی تغیر صرف اس بنیاد پر ہو سکتا ہے کہ رائے عام اس تغیر کی خواہش مند ہے۔ اگر یہ صورت ہم نے موجود پائی تو ہم وقت کے دستورِ حکومت کو تبدیل کرنے اور اسلامی اصول پر نیا دستور بنانے کا مطالبہ ملک کی رائے عامہ کے سامنے پیش کریں گے . . . . اور وقت کے سیاسی نظام پر دباؤ ڈالیں گے کہ وہ ایک نئی دستور ساز اسمبلی منعقد کرے جو اس امر کا فیصلہ کرے کہ ملک کا آئندہ دستور کیا ہو۔ اس اسمبلی کے الیکشن میں ہم پوری کوشش کریں گے کہ رائے عامہ کی تائید سے ہم کو اکثریت حاصل ہو اور ہم ملک کا دستور اسلامی اصولوں پر قائم کریں۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس پروگرام کو ایک بڑا لمبا پروگرام سمجھتے ہیں . . . .
. . . . لیکن واقعہ یہ ہے کہ . ۔۔ سارا دیر طلب کام صرف اس ابتدائی مرحلے گروہ

کی تنظیم و تربیت کا ہے جو اسلامی انقلاب کی ایک وسیع تحریک کا موزوں محرک ہوسکے۔ ..... اس ابتدائی مرحلہ کے گذرنے کے بعد ہماری منزلِ مقصود اتنی دُور نہیں رہیگی جتنی بہت سے لوگ کام کئے بغیر صرف اپنے خیال میں دُور سمجھ رہے ہیں۔ تاہم اگر یہ دُور بھی ہو تو چونکہ منزلِ حق یہی ہے اسلئے ہم اس کی طرف دوڑتے ہوئے مرجانا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں بہ نسبت **اس کے کہ جانتے بوجھتے غلط مگر آسان راہوں میں اپنی قوت صرف کریں یا بے وقوفی کے ساتھ جنت الحمقاء کے حصول میں اپنی قوت ضائع کریں۔**" (ترجمان القرآن فروری ۱۹۳۶ء)

آپ کے محولہ بالا پروگرام سے (جسے آپ نے "منزلِ حق" کے نام سے موسوم فرمایا ہے) صاف معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کے لئے تیار ہیں مگر اسے چھوڑ کر کسی جنت الحمقاء سے اپنی امیدیں وابستہ کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ——— مگر افسوس فسادات ۱۹۴۷ء کے شروع میں تو جناب مودودی صاحب نے بڑی جوانمردی سے یہ اعلان کیا کہ "اگر کسی علاقے کے مسلمانوں کے قومی اخراج کی نوبت آجائے تو اپنی جگہ چھوڑنے والوں میں ہم سب سے پہلے نہیں بلکہ سب سے آخری ہوں گے" مگر جب جمالپور سرکاری کیمپ بنا دیا گیا تو آپ اپنا "دارالاسلام" ہندو اور سکھوں کے ہاتھ میں چھوڑ کر ۳۰ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان ("جنت الحمقاء") میں تشریف لے آئے۔

جمالپور اور قادیان کی فیصلہ کن مثال۔

حالانکہ جماعت احمدیہ کا مرکز بھی جمالپور کی طرح گورداسپور ہی میں واقع تھا اور جمالپور سے بڑھ کر غنڈہ گردی کا شکار ہو رہا تھا۔ ان تمام بے سروسامانیوں کی حالت میں پاکستان نے اس میں اپنا کیمپ بھی نہیں بنایا تھا۔ بایں ہمہ احمدی مردِ مجاہد تھا کہ جان کی بازی لگائے قادیان کی حفاظت میں اُس وقت بھی مصروف تھا اور آج بھی مصروف ہے۔ مادی لیڈروں کی قیادت، ان کی مرکزیت اور جماعت کے مقابل الٰہی تحریکوں کا انقلاب جس قدر واضح بیّن اور روشن ہوا کرتا ہے اس کی فیصلہ کن مثال قادیان اور جمالپور آج بھی پیش کر رہے ہیں۔

جمالپور کو "دارالاسلام" بنانے والے اپنے ساز و سامان "مقدس مقامات" اور مساجد چھوڑ کر پاکستان آگئے اور ان کا مرکز ہندوؤں اور سکھوں کے مندروں اور شرابخانوں کا اڈہ بن گیا۔ مگر خدائی مرکز اس وقت بھی اُفقِ ہند پہ اسلام کا سورج بن کر چمک رہا ہے اور وہ دن دُور نہیں کہ ہندوستان محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کے دستورِ حیات کی تجلّیوں سے بقعۂ نور بن جائے گا۔ انشاء اللہ۔

شاید کہا جائے کہ وہ آتش فضا جس نے ۱۹۴۷ء میں ایک قتلِ عام کا سماں باندھ دیا تھا اس "ہجرت" کی ذمہ دار ہے ورنہ مودودی صاحب تو اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا عزم بالجزم رکھتے تھے ایک لحہ کے لئے تسلیم کیا کہ مودودی صاحب جس پروگرام کو "منزلِ حق" بتا رہے تھے اور اس کے تحفظ کے لئے کٹ مرنے کو تیار بیٹھے تھے وہ آپ کے ہاتھوں اب جمالپور کے مرکز (سوسائٹی) سے پایۂ تکمیل تک پہنچتا تو الگ رہا جاری بھی نہ رہ سکتا تھا۔ مگر جماعت اسلامی کے انصاف پسند بزرگوں سے درخواست

کر دیں گا کہ وہ اس بات پر غور فرمائیں کہ ملکوں اور زمینوں
کی تبدیلی سے "منزل حق" شاہراہ باطل تو نہیں
بن جاتی۔ اور نہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۸ء کے سن کی تبدیلی
میں کوئی ایسا اثر ہے کہ منزل کے سنگ راہ الٹ کے
کسی اور طرف جا پڑیں اور حق باطل سے ہم آغوش
ہو جاتے۔

اگر ایسا نہیں اور نہ ہو سکتا ہے تو آخر مولانا
مودودی صاحب نے جس پروگرام کو دو سال قبل اپنا
صحیح طریق کار قرار دیا تھا اسے پاکستان میں آکر کیوں
فراموش کر دیا۔ کیا ۱۹۴۷ء کے ارکان جماعت کی موجودگی
میں عام مسلمانوں کے مخلوط انبوہ میں سے جو صالح عنصر منظم
کرنے کی ضرورت کا پوری شدت سے احساس کر رہے تھے
وہ صالح عنصر ۱۹۴۷ء کی ہجرت کے معاً بعد حاصل ہو گیا
تھا یا خود رائے عام ہی اس حد تک تیار ہو گئی تھی کہ اب
کوئی گروہ انہیں بے وقوف بنا کر غیر اسلامی مقاصد کے
نام سے ووٹ (Vote) نہیں خرید سکتا تھا؟

جماعت اسلامی کی حالت

مودودی صاحب کے ارکان نے ۱۹۴۷ء کی
ہجرت کے بعد جس تقویٰ شعاری اور اخلاق اور صالحیت
کا نمونہ دکھایا ہے اس کے متعلق مودودی صاحب اور
جماعت اسلامی کے تمام چیدہ چیدہ بزرگوں کی مجلس شوریٰ
(منعقدہ ۱۵ تا ۱۹ اپریل ۱۹۵۰ء) کا فیصلہ یہ ہے:-

"جو جماعت اقامت دین کی جدوجہد
کے لئے بنی ہوئی ہے کہ جماعت اسلامی ہے۔
اس کے ارکان میں جس درجے کا نظم و ضبط اور
سمع و اطاعت ہونی چاہئے وہ بہت سے ارکان
میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ جس زمانے میں اس کی
ضرورت سب سے زیادہ شدید تھی اس زمانے
میں بعض ارکان کا رویہ اپنے صاحب امر سے
عدم تعاون کا سا رہا ہے۔ یہ کمزوری شدت
سے قابل اصلاح ہے ..... اگر وہ درحقیقت
اقامت دین کے مقصد سے وابستگی رکھتے
ہیں تو اس کے ہاتھ مضبوط کرنا ان کا فرض
ہے۔ خصوصیت کے ساتھ آئندہ الیکشن کے
موقع پر ..... عدم اطاعت اور عدم تعاون
کی کمی صاف طور پر یہ معنی رکھتی ہے کہ اپنے
مقصد کی بجائے اپنے مخالفین کے مقصد
کی خدمت بجا لا رہے ہیں" (روداد مجلس شوریٰ
شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ)

یہ کیفیت ہے اس جماعت کی جس کو مودودی صاحب نے
لاہور کے کھلے اجتماع میں "اسلام کی ریزرو فورس" کے نام
سے موسوم کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

"جن لوگوں کے ہاتھوں میں قوم کی قیادت
کی باگ ڈور تھی ان کے متعلق ہم خوب سمجھتے تھے
کہ وہ اس ملک میں اسلامی بنیادوں پر ایک مکمل
نظام حکومت قائم کرنے کے اہل نہیں۔ اور اس
صورت میں بھی ضروری تھا کہ "اسلام کی ریزرو
فورس" اس وقت ہر کام کرنے کے لئے موجود
ہو ..... یہ کوئی قاعدہ نہیں کہ کسی جنگ میں
پوری قوم کو جھونک دیا جائے۔ جو الگ گوشوں
میں بیٹھ کر سامان جنگ تیار کرتے ہیں وہ بھی
جنگ ہی کا کام کرتے ہیں۔" (اخبار کوثر ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء)

پاکستان کے عوام

ارکان جماعت پر نگاہ ڈالنے کے بعد
اب آئیے قوم کا جائزہ لیں۔ مولانا مودودی
صاحب نے جماعت اسلامی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے
بیس مارچ ۱۹۵۱ء کو فرمایا:-

"ہماری قوم بے دینی میں اس حد تک
بڑھ چکی ہے کہ بے پناہ مصائب کے ہجوم میں بھی

بہت کم لوگوں کو خدا یاد آیا۔ حتیٰ کہ عین خطرے میں گھرے ہوئے لوگوں میں بھی نماز پڑھنے کا خیال حد درجہ کم رہا۔ پھر موت سامنے دیکھ کر بھی لوگ بلیک مارکیٹ کرتے رہے۔ پھر ہمارے انصار نے رشوت ستانی اور تسکین شہوت وغیرہ کے جو کارنامے دکھائے ہیں وہ بھی آپ کے سامنے ہیں۔"

"قوم کو اسلام کے نام سے تو محبت ہے لیکن اسلام سے ناواقفیت میں اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق نہیں کر سکتی۔ جمہوری نظام میں جب عوام ہی اسکی اصل طاقت ہوں اور ان کا یہ حال ہو تو عاقبت معلوم۔" (کوثر یکم اپریل ۱۹۴۷ء)

عوام کے نا تربیت یافتہ گروہ اور خود ارکان جماعت کے غیر اسلامی طریق کو دیکھتے ہوئے کیا مودودی صاحب کا یہ فرض نہ تھا کہ اپنے پروگرام کے مطابق سب سے قبل وہ پہلے تو مسلمانوں کے انبوہ میں سے اسلامی انقلاب کا محرک بننے والا صالح گروہ ترتیب دیتے اور پھر اس کے ذریعہ سے عام مسلمین میں اسلامی شعور پیدا کرتے اور انہیں اس قابل بنا دیتے کہ وہ صرف اسلام کو ووٹ دے سکیں اور سر دھڑ کی بازی لگانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ جب یہ بنیادی مراحل طے ہو جاتے تو پھر ملک کی جمہوری فضا دیکھتے۔ اور پھر ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد "دستور اسلامی" کا مطالبہ پاکستان کی رائے عامہ کے سامنے پیش کرتے اور وقت کے سیاسی نظام پر دباؤ ڈالتے کہ ایک نئی دستور ساز اسمبلی منعقد کرے جو ملک کے آئندہ دستور کے متعلق فیصلہ کرے۔

جب یہ تمام امور طے پا جاتے تب آپ ملک کے الیکشن میں "اسلامی دستور" کے فیصلے کرواتے اور پاکستان کو "اسلامی حکومت" بنا دیتے۔

مودودی صاحب کی سیاسی زندگی کا آغاز

مطالبۂ نظامِ اسلامی

لیکن کس قدر حیرت ہے کہ جناب مودودی صاحب نے پاکستان پہنچتے ہی پہلی دو اہم اور سب سے ضروری منازل کو ترک کر کے تیسری منزل کی طرف لپکنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور عوام مسلمین اور اپنے ارکان کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۴۸ء کے آغاز میں تمام مغربی پاکستان کا دورہ کر کے عوام کے سامنے پراپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ مسلمانو! تم نے لا الٰہ الا اللہ کی خاطر پاکستان کو ووٹ دیئے تھے مگر برسر اقتدار طبقہ اب اپنے پرانے وعدوں کو پس پشت ڈالنا چاہتا ہے اور کافرانہ نظام پھر پاکستان میں ہمیشہ کے لئے برقرار رکھنا چاہتا ہے اسلئے پوری قوت سے اس بات کا مطالبہ کرو کہ ہم اس جگہ اسلام کی حکومت بنانا چاہتے ہیں۔ اسی قسم کی تقریریں آپ نے لاہور، لائلپور، ملتان، منٹگمری، کراچی، راولپنڈی اور گوجرانوالہ وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں فرمائیں۔

دو تین ماہ بعد "جماعت اسلامی" کے افراد نے اس مطالبہ کو ایک منظم شکل دیکر بے شمار اشتہار، پمفلٹ اور ٹریکٹس شائع کرنے شروع کر دیئے۔ بھولے بھالے مسلمان "صالح قیادت" اور "اسلامی دستورِ حیات" کے نام سے بے حد متاثر ہوئے جگہ جگہ جلسے منعقد ہوئے۔ ریزولیوشنز اور قراردادوں کا تو تانتا بندھا رہتا تھا سینکڑوں تار روزانہ گورنر جنرل، وزیر اعظم اور دوسرے وزراء حکومت کی میزوں پر پہنچ جاتے تھے۔ اور دن رات مودودی صاحب کے رفقاء دیواروں پر اس مضمون کے موٹے سیاہی سے لکھتے رہتے تھے کہ انگریز چلا گیا، انگریز کا قانون کب جائے گا۔ غرضیکہ ایک

طوفان تھا جس نے پاکستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ ہزاروں حقیقت شناس انسانوں نے مودودی صاحب اور اُن کے رفقاء کو سمجھایا، دلائل دیئے، منتیں کیں کہ خدارا قوم کے قیمتی اوقات ہنگاموں، ریزولیوشنز اور عام مظاہروں میں ضائع کرنے کی بجائے عوام اور ان سے زیادہ اپنی جماعت کی تربیت کیجئے اور رائے عامہ کو صحیح اسلامی جذبہ سے آشنا کیجئے۔ اس میں اگر آپ کامیاب ہو جائیں گے تو ان جھگڑوں اور تحصنوں کے بغیر صحیح اسلامی حکومت بن جائے گی۔ جناب مودودی صاحب اس کا یہ جواب دیتے کہ:۔

"اس نظام کو مسلمان بنانے کے لئے اگر کوئی بنیادی تبدیلی سب سے پہلے کرنے کی ہے تو وہ یہی ہے کہ جس طرح فرد کو مسلمان بنانے کیلئے کلمہ پڑھایا جاتا ہے اسی طرح اُسے بھی کلمہ پڑھایا جائے۔ ایک حکومت کو کلمہ پڑھانے کیلئے جو دستوری طریقہ ہو سکتا ہے اسے ہم نے ایک مطالبہ کی شکل میں مرتب کیا ہے۔"

(ترجمان القرآن جلد ۳۲ نمبر ۱)

پھر فرماتے ہیں:۔

"اس مطالبہ کی ضرورت اسلئے پیش آئی کہ یہاں ایک مصنوعی انقلاب رونما ہوا ہے۔ اگر یہ انقلاب اسلامی اصولوں کے مطابق فطری طور پر ابھرتا ہوا ہوتا تو اس مطالبہ کی ضرورت پیش نہ آتی۔" (ایضاً)

آپ سے یہ بھی عرض کی گئی کہ حکومت پاکستان کے لیڈر اسلامی حکومت کے قیام کا بار بار وعدہ کر رہے ہیں اسلئے اس طرح شورش نہ برپا کیجئے کہ مسلمانوں کی حکومت جو پوری ایک صدی کے بعد معرضِ وجود میں آئی ہے سرے سے ناپید ہو جائے۔ اس پر مولانا صاحب برافروختہ ہو کر تقریروں میں جواب دیا کرتے تھے:۔

"ہمارے ارباب اقتدار میں سے ننانوے فیصدی بددیانت اور ناقابلِ اعتماد نکلے ہیں۔"

(کوثر یکم اپریل ۴۳ء صفحہ ۶)

مولانا صاحب کی اس خلافِ عقل و فہم روش کو دیکھ کر جناب روشن دین صاحب تنویر نے قلم اٹھایا اور ان کے بعض اہم کونوں کو کمال متانت اور خوبی سے پبلک کے سامنے آشکار کر کے رکھ دیا۔ آپ کے مضامین نے صاحبِ علم طبقہ کی اس تحریک کو سمجھنے میں کافی رہنمائی کی ہے۔ ([illegible])

حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی صحیح قیادت

اسکے علاوہ خود حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اسلامی حکومت کے طریق، اس کی ضرورت اور اس کے نفاذ کی صحیح صورتیں پیش فرمائیں اور اصولی طور پر قریباً ہر پہلو پر روشنی ڈالی اور ہر طبقہ کو قیمتی ہدایات دیں۔ چنانچہ آپ نے عام مسلمانوں سے کہا کہ وہ احکام جن پر آپ کسی قانون یا طاقت کے بغیر عمل کر سکتے ہیں ان پر فوراً عمل شروع کر دیں۔

نظامِ اسلامی کے مخالفین سے فرمایا کہ انہیں اسلام کے پُرحکمت نظام سے بدکنے کی بجائے اسکے پاکیزہ اصولوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ گورنمنٹ سے فرمایا کہ کوئی وجہ نہیں ...... جبکہ پاکستان کی اکثریت مسلمان ہے یہاں ان کا مذہبی دستور نافذ نہ کیا جائے۔ جماعتِ احمدیہ کو ذکر کر کے بتایا کہ حکومت کے ساتھ مذہبی تنظیموں کے وابستہ کر دینے سے اسلام کو بہت نقصان پہنچا ہے اسلئے آئندہ چاہیئے کہ خلافت اور حکومت کا نظام الگ الگ رہے اور پاکستان کو کلمہ پڑھانے کی نرالی ترکیبیں سوچنے والوں کو توجہ دلائی کہ:۔

"اگر اسلام کا نام حکومت کو دینگے تو غیر مسلموں

کا تو کچھ نہیں بگڑے گا کیونکہ اسلام انہیں پرسنل لاء کے معاملہ میں پوری آزادی دیگا اور ویسے بھی اسلامی لاء کے ماتحت انہیں ترقی کے پورے مواقع مل جائیں گے لیکن جہاں غیر مسلموں کی حکومت ہوگی اور مسلمان اقلیت میں ہوں گے وہاں انہیں مسلمانوں کو تنگ کرنے کا موقع ضرور مل جائے گا ...

..... پس میرے نزدیک مذہب کا نام دینے کی ضرورت نہیں۔ اصل غرض تو مذہبی احکام کو نافذ کرنے سے ہے۔ سو جس جگہ بھی مسلمانوں کی اکثریت ہو اس کا فرض ہے کہ وہ اسلامی احکامات کو نافذ کرنے کی کوشش کریں۔" (الفضل ۱۹ر دسمبر ۱۹۴۷ء)

حضرت اقدس کی ان ہدایات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جماعت احمدیہ پاکستان میں جلد از جلد اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے بے قرار ہے۔ فرق صرف ان قوانین کے طریق کار اور ان کو مذہبی گورنمنٹ سے موسوم کرنے میں تھا۔ مگر مودودی صاحب کے رفقاء کی "صالحیت" ملاحظہ ہو کہ وہ جماعت احمدیہ کے متعلق آج تک یہ پراپیگنڈا کر رہے ہیں:۔

"یہ گروہ ..... نظامِ اسلامی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔" (جہانِ نو ۱ر اگست ۱۹۶۲ء)

مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کی یہ تمام ہنگامہ آرائی (جو روحِ اسلام کے بھی منافی تھی اور خود ان کے پروگرام کے بھی) صاف طور پر بتا رہی تھی کہ تحریک کے علمبردار اپنے "مطالبۂ نظام اسلامی" میں سیاسی مصالح کا شکار ہو رہے ہیں۔ کیونکہ جب صاف نظر آ رہا ہے کہ پورا معاشرہ ابتدائی تربیت کا بھی محتاج ہے تو پارلیمنٹ کی دستوری قراردادوں سے کیا بنے گا؟ یہ حقیقت اب بہت کچھ ابھر بھی چکی تھی۔ سوچنے والے سوچ بھی رہے تھے اور زبانیں کسی نہ کسی انداز میں اس کا اعتراف بھی کر رہی تھیں۔ مگر ایک بہت بڑا طبقہ ابھی حسن ظن میں مبتلا تھا کہ خوائے انتخابات اور الٰہی قیادت کا امتیاز بتانے کے لئے عجیب سامان پیدا کر دیا جس نے مودودی صاحب کے مقامِ تفقہ اور اسلام کے مزاج سے واقف ہونے کا سارا راز طشت از بام کر دیا۔

"مولانا" کا فتویٰ کشمیر

واقعہ یوں ہوا کہ مئی ۱۹۴۸ء کے دوسرے ہفتہ میں آزاد کشمیر گورنمنٹ کے نشر و اشاعت کے انچارج جناب نبی بخش صاحب نظامی نے یہ شکر کر کہ مولانا مودودی صاحب جماعت اسلامی سرحد کے اجتماع کے موقع پر پشاور آئے ہوئے ہیں ایک ملاقات میں آپ سے پوچھا کہ آپ جہادِ کشمیر میں عملی حصہ کیوں نہیں لیتے؟ مولانا نے پہلے تو جواب دینے سے انکار کر دیا۔ مگر پھر بڑے اصرار کے بعد آپ نے فرمایا میں شرعاً اسے جہاد ہی قرار نہیں دیتا۔ یہ انٹرویو جب اخبارات میں شائع ہو گیا تو تمام پاکستان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اس پر آپ نے تسنیم[1] میں ایک لمبا چوڑا بیان شائع کروایا۔ اس بیان میں آپ نے اپنے مسلک کی تائید میں سورۂ انفال کی یہ آیت پیش کی:۔

"والذین آمنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شیء حتی یھاجروا وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر الا علی قوم بینکم وبینھم میثاق واللہ بما تعملون بصیر (۲۴ع)"

"یعنے جو لوگ ایمان تو لائے مگر ہجرت کر کے تمہارے پاس نہیں آئے ان کی ولایت کا کوئی

---

[1] ۱۲ر اگست ۱۹۴۸ء [2] مترجم محمد طفیل صاحب قیم جماعت اسلامی۔ قاصد ۱۰ر ستمبر ۱۹۵۰ء)

تعلق تم سے نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کرکے نہ آجائیں۔ البتہ اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو مدد کرنا تم پر واجب ہے۔ مگر کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ (میثاق) ہو اور اللہ دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو۔"

اس آیت میں "میثاق" کا جو لفظ ہے اس سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دو حکومتوں کے درمیان اگر معاہدہ ہو تو اسلام دوسری حکومت میں بسنے والے مسلمانوں کی اعانت کے لئے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس دور از حقیقت تاویل پر بنیاد رکھنے کے بعد آپ نے ہند و پاکستان کے معاہدات یوں گنائے :-

"اوّلاً دونوں حکومتوں کی پیدائش ہی ایک معاہدہ کے ذریعہ سے ہوئی ہے ..... اس کے بعد دونوں حکومتوں کے درمیان فوراً سفارتی تعلقات قائم ہوگئے ہیں۔ ہائی کمشنروں کا تبادلہ ہوا۔ سفارتی تعلقات ہمیشہ سے حالتِ جنگ کے نہ ہونے کی دلیل سمجھے جاتے ہیں۔ پھر دونوں حکومتوں کے درمیان مالی اور تجارتی معاملات اور مہاجرین کے مختلف مسائل، اغوا شدہ عورتوں کی بازیافت اور کرنسی کے معاملات کے متعلق مسلسل سمجھوتے ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام سمجھوتے اس بات کی دلیل ہیں کہ ان کے درمیان حالتِ جنگ قائم نہیں ہے۔ دنیا کی کوئی قوم بھی کسی دوسری قوم سے مالی اور تجارتی لین دین اس حالت میں نہیں کرتی جبکہ وہ اُسے اپنے خلاف برسرِ جنگ سمجھتی ہو۔ اس کے بعد ابھی اپریل ۱۹۴۸ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان کلکتے کا معاہدہ ہوا ہے ...... اس کے صاف معنے ہیں کہ دونوں حکومتیں مصالحانہ تعلقات رکھتی ہیں۔"

پھر میثاق اور بیان کردہ معاہدات کو آپس میں ملا کر آپ نے یہ فتویٰ دیا کہ :-

"جب تک حکومتِ پاکستان نے حکومتِ ہند کے ساتھ معاہدانہ تعلقات قائم کر رکھے ہیں پاکستانیوں کے لئے کشمیر میں ہندوستانی فوجوں سے لڑنا ازروئے قرآن جائز نہیں ہے۔"

(تسنیم ۱۴ر اگست ۱۹۴۸ء)

مولانا مودودی صاحب اس فتویٰ سے قبل اخبارات و رسائل کے اوراق پر تو "اسلام" کے نظامِ حکومت کا نقشہ کئی بار دکھا چکے تھے مگر ایک اسلامی مملکت کی الجھنوں کو قرآنی لائنوں پر سلجھا کر دکھانے کا یہی پہلا اور آخری موقع ہاتھ آیا تھا۔ مولانا اگر قرآن مجید کے نظمِ سیاست کا تحقیقی مطالعہ رکھتے تو کم از کم کشمیر جیسے نازک معاملہ میں جس کے ساتھ اس ملک کی ہستی کا بقا تھا نیز جس پر آپ کے نقطۂ نظر سے بھی اسلام کے مستقبل کا انحصار تھا کبھی ایسی غیر ذمہ دارانہ روش اختیار نہ فرماتے مگر انہوں نے اوّل تو جنگِ کشمیر سے عملاً گریز کیا دوم قرآن کے لفظ میثاق کو نامناسب وسعت دیکر کشمیر کی جنگ کو ناجائز قرار دے دیا۔ حالانکہ جیسا کہ سورۂ نساء رکوع ۷ سے معلوم ہوتا ہے یہاں عام معاہدات کا ذکر نہیں بلکہ صرف عدمِ اعتداء یا عدمِ نصرتِ اعداء کا معاہدہ مراد ہے۔ اور یہ بات پہلے روز سے مودودی صاحب کو بھی مسلّم تھی کہ کم از کم کشمیر کے بارہ میں انڈیا اور

ے کوثر یکم اپریل ۱۹۴۸ء

پاکستان کے درمیان ایسا کوئی معاہدہ عمل میں نہیں آیا آپ کا اعتراف ان الفاظ میں شائع ہو چکا تھا "کشمیر کے معاملہ میں حکومت ہند اور حکومت پاکستان کا کوئی معاہدہ نہیں ہوا بلکہ یہ معاملہ ان کے درمیان ما بہ النزاع ہے اور حکومت پاکستان انڈین یونین کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو تسلیم کرنے سے انکار کر چکی ہے"۔ (ترجمان القرآن جون ۱۹۴۹ء)

ان واضح حقائق کے باوجود اگر یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ ہند و پاکستان کے درمیان قرآنی معاہدہ ہو چکا تھا تب بھی جس صورت میں مودودی صاحب اپنے بیان میں بھی بتا چکے تھے کہ حکومت ہند نے ریاست جوناگڑھ اور حیدرآباد پر قبضہ کر کے پہلے خود ہی اس میثاق کو چاک چاک کر دیا ہے۔ شرعی لحاظ سے حکومت پاکستان اپنے ہر اقدام میں آزاد تھی کیونکہ معاہدہ کے توڑنے کی ذمہ داری حکومت ہندوستان پر آتی تھی نہ کہ پاکستان پر لیکن مودودی صاحب کا یہ فتویٰ قرآن مجید کی نمائندگی میں بھی نہیں تھا اور اس نے دشمنان پاکستان کو بھی پوری تقویت پہنچائی۔ کشمیر جموں ریڈیو نے اسے بار بار پیش کیا اور سکھ اخبارات نے اس بنا پر آپ کو "مردِ مجاہد"، "مردِ خدا" اور "شمعِ ہدایت" کے خطابات بخشے۔[1] اس کیفیت کو دیکھ کر مسلمانوں نے یہ کہا کہ در پردہ انڈین یونین ان کی مدد کر رہی ہے ورنہ اس قدر پمفلٹ بازی اور ہنگاموں اور اجتماعوں کے لئے انہیں کونسا "الٰہ دین کا چراغ" مل گیا ہے۔ اپنا راز کھلتا دیکھ کر مودودی تحریک کے سربراہوں نے گھبرا کر یہ جواب تیار کیا:۔

"ہمارے ہاں گذشتہ پچاس ساٹھ سال میں جتنی جماعت بندیاں ہوئی ہیں ان کے مالیات کا دارومدار دو قسم کے ذرائع آمدنی پر رہا ہے (۱) فیس داخلہ اور چندہ رکنیت (۲) جماعتی ضروریات کے لئے مختلف فنڈ قائم کر کے قوم کے سامنے چندے کی اپیلیں کرنا ..... بخلاف ان کے جماعت اسلامی .... نے اپنے طریق کار کے ہر گوشے کو اسوۂ انبیاء کے چراغوں سے روشن کرنے کا قطعی اصول طے کر لیا تھا اس وجہ سے اس نے فیس اور چندہ رکنیت کے طریقے سے بالکل ہٹ کر اسلامی جذبہ انفاق پر اپنے مالیات کا دارومدار رکھا اور خدا تعالیٰ کے اس پسندیدہ طریق کار کو اختیار کرنے میں خود خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے وہ برکتیں ظہور میں آئیں کہ جماعت کا کوئی کام محض مالی وجوہ سے کبھی اٹکا نہ رہا۔ اور نہ انشاء اللہ آئندہ اٹکے گا۔"

(ترجمان القرآن جون ۱۹۴۹ء صفحہ ۱۲۹)

اس جواب سے انہیں یقین ہو گیا کہ یہ معصوم بندے واقعی غیبی برکتوں کی بدولت ہی زندہ ہیں۔

فتویٰ قرآن کے خلاف محاذ

یہ کھیل ابھی جاری ہی تھا کہ ــــ آپ نے ایک اور ڈرامہ شروع کر دیا اور وہ یہ کہ پہلے تو آپ حکومت پاکستان کے خلاف قرآن کا ایک فتویٰ پیش کر رہے تھے اب آپ نے چند دنوں کے بعد خود قرآن مجید کے اس فتویٰ کی مخالفت میں محاذ قائم کر لیا اور ہیدرد تا اٹھارہ ستمبر میں منعقد ہونے والی مجلس شوریٰ کی زبان سے یہ اعلان شائع کروا دیا:۔

"اب معاہدانہ تعلقات کے باوجود اہل پاکستان کے لئے جہاد کشمیر میں جنگی حصہ لینا بالکل جائز ہے" (قاصد ۱۲ ستمبر ۱۹۴۹ء)

---

[1] سیر پنجاب بحوالہ نوائے پاکستان ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء۔

اس اعلان نے عوامی جوش کو تو سکون دے دیا مگر اہلِ علم کی حیرانی میں اور بھی اضافہ کر دیا کہ جب وہ تمام معاہدات اب بھی قائم ہیں جن کی وجہ سے علامہ مودودی صاحب نے جنگ کو ناجائز قرار دیا تھا تو چند ہی روز بعد یہ "ناجائز" امر "جائز" کیسے ہو گیا؟ یہ وہ زبردست سوال ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق جماعتِ اسلامی کے امیر اور ان کے رفقاء کو آج تک بھی نہیں ہو سکی۔

ابتداءً میں سجدہ سہو کرتے ہوئے مجلس شوریٰ نے جو دلیل پیش کی وہ بیحد مضحکہ خیز تھی۔ اس نے لکھا:-

"امیر جماعت نے اپنے پچھلے بیانات میں جو شرعی مسئلہ بیان کیا تھا وہ اس حالت سے متعلق تھا جبکہ سرکاری طور پر اس امر کا کوئی اقرار و اظہار نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کی فوجیں حدودِ کشمیر میں موجود ہیں۔ اب ۷ ستمبر کو مجلس اقوامِ متحدہ کے کشمیر کمیشن سے حکومتِ پاکستان کی جو مراسلت شائع ہوئی ہے اور وزیرِ خارجہ پاکستان نے ۸ ستمبر کو جو بیان دیا ہے اس میں اس امر کا واضح اقرار موجود ہے اور حکومتِ ہند بھی اس پر مطلع ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب چونکہ معاملے کی نوعیت بدل گئی ہے اس بنا پر اس کا شرعی حکم بھی وہ نہیں ہو گا جو پہلے تھا۔" (مولانا کی نظر بندی کیوں۔ نشر و اشاعت جماعتِ اسلامی ص۱۲)

اس دلیل کو پڑھتے ہوئے ذرا اصل فتویٰ بھی پڑھ لیجئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:-

"جب تک حکومتِ پاکستان نے حکومتِ ہند کے ساتھ معاہدانہ تعلقات قائم کر رکھے ہیں پاکستانیوں کے لئے کشمیر میں ہندوستانی فوجوں سے لڑنا از روئے قرآن جائز نہیں ہے۔" (تسنیم ۱۲ اگست ۱۹۴۸ء)

کوئی بتائے جب قرآن کی رو سے کشمیر میں جنگ لڑنے کی ایک ہی صورت ہے کہ پاکستان اپنے معاہدانہ تعلقات کو ختم کر دے تو محض کمیشن کے سامنے اس بات کے اظہار کو کہ ہماری فوجیں کشمیر میں موجود ہیں فتویٰ کی نوعیت کیسے بدل سکتی ہے اور جنگ کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اس طریق سے تو فتویٰ کی شدت میں کچھ اضافہ ہی ہونا چاہیئے تھا کہ پاکستان ہندوستان سے معاہدانہ تعلقات کا دعویٰ بھی رکھتا ہے مگر اس کے باوجود کمیشن کے سامنے یہ بھی اعتراف ہے کہ اس کی فوجیں کشمیر میں معرکہ آرا ہیں۔ مجلسِ شوریٰ نے اپنی قرارداد کے آخری الفاظ میں اپنی اس دلیل اور مودودی صاحب کے فتویٰ میں جبراً تطبیق پیدا کرنے کے لئے جو استدلال کیا وہ خود بھی نرالی طرز کا تھا۔ چنانچہ لکھا:-

"اب دونوں مملکتوں کے درمیان اگر ایسے کوئی تعلقات ہیں تو اسکے صریح معنے یہ ہیں کہ ایک علاقہ میں حالتِ جنگ کا قیام اور دوسرے تمام علاقوں میں مصالحانہ روابط کا بقا فریقین کی رضامندی سے ہے۔"
(قاصد کشمیر نمبر ص۱)

اس استدلال کی معقولیت اس سے واضح ہے کہ جب مودودی صاحب پہلے سے یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ کشمیر کے بارے میں پاکستان ہندوستان کو ابتدا سے غاصب ہی سمجھتا رہا ہے اور اس کے باوجود باقی معاملات میں اس نے ابتدا سے شروع سے ہی معاہدانہ تعلقات قائم کر رکھے ہیں تو اس قدیم صورتِ حال کے آخر دن تک موجود ہوتے ہوئے اب جنگ کا جواز کیسے نکل سکتا ہے؟

یہ بات اس قدر واضح تھی کہ لاہور میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۰ عیسوی کے کھلے اجلاس میں جب مولانا مودودی صاحب

کے سامنے ان کے موقف کشمیر کے متعلق سوال کیا گیا تو مولانا کو اپنے طور پر ایک نیا جواب ایجاد کر کے اسے مجلس شوریٰ کی طرف منسوب کرنا پڑا۔ چنانچہ مجلس کے اس استدلال کو آپ نے اپنے سانچے میں ڈھالتے ہوئے کہا:-

"جماعت اسلامی کی شوریٰ نے باقاعدہ
اپنے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ اس بات کا
اعلان کر دیا کہ بلا شبہ اب ہمارے لیے
کشمیر میں جنگ کرنا بالکل جائز ہے۔ کیونکہ
اب قوم اور اس کے نمائندوں کے
قول اور عمل میں وہ تضاد باقی نہیں
رہا جس کو ہم ناروا سمجھتے تھے۔"
(دستوری سفارشات پر تنقید ص ۴۲)

مجلس شوریٰ کے اصل استدلال کے بالمقابل مودودی صاحب نے اس کے نام پر جو جدید توجیہ بیان فرمائی ہے وہ کس قدر الٹ ہے؟ اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال اس مختصر سی بحث سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ فتویٰ کشمیر میں جناب مودودی صاحب کا مسلک عجوبۂ روزگار سے کم نہیں۔ اور جماعت اسلامی کا فرض ہے کہ وہ اس مطالبے کا جواب دے۔ کہ اگر معاہدانہ تعلقات کی وجہ سے پاکستان کا حکومت ہند کے خلاف کشمیر میں برسرِ پیکار ہونا جائز نہیں تھا تو اب کیسے جائز ہو گیا ہے۔ اور اگر قرآنی میثاق ہندوستان کے معاہدانہ تعلقات پر چسپاں نہیں ہو سکتا تو ابتداء میں جنگی کارروائی کیسے ناجائز تھی؟

اس مختصر سے مطالبے کا جواب جماعت اسلامی پر چھوڑتے ہوئے اب ہم اپنے پچھلے بیان کی طرف لوٹتے ہیں۔ ہم یہ کہہ رہے تھے کہ جناب مودودی صاحب نے پاکستان آتے ہی اپنی "منزلِ حق" کے بالکل مخالف سمت میں دوڑنا شروع کر دیا اور عوام کی تربیت اور اپنی جماعت کی تربیت و اصلاح کی بجائے اپنی ساری قوتیں اس پر مرکوز کرنی شروع کر دیں کہ کسی طرح پارلیمنٹ کو کلمہ پڑھایا جائے۔ ان کی اس روش کو دیکھ کر اہلِ پاکستان نے یہ محسوس کیا کہ یہ "کلمہ پڑھانے والے" بعض سیاسی مصلحتوں سے اُلجھے ہوئے ہیں اور نظامِ اسلامی کے مطالبے کے پیچھے سیاسی عزائم پوشیدہ ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی ذکر کیا گیا کہ کس طرح مسئلہ کشمیر نے ان کی "صالحیت" اور مقامِ تقدس کے طلسم کو دھوئیں کی طرح اُڑا دیا۔ اب یہ بتاتے ہیں کہ اس راز کے کھل جانے کے بعد یہ تو واضح ہو گیا کہ علامہ مودودی صاحب "نظامِ اسلامی" کا لفظی خاکہ تو تیار کر سکتے ہیں مگر اسے واقعات کی دنیا میں لانے کی انہیں اہلیت نہیں لیکن ابھی قدرت کی طرف سے یہ اعلان باقی تھا کہ جناب مودودی صاحب نظامِ اسلامی کے نام پر سیاست میں چھلانگ لگانا چاہتے ہیں اور اسے اپنے سیاسی اقتدار کے لئے بطور آلہ کے استعمال کر رہے ہیں۔

اس دلچسپ سرگذشت کے ذکر کرنے سے پیشتر آئندہ واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کیلئے ضمناً یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ فتویٰ کشمیر کے تین ماہ بعد علامہ مودودی صاحب اور جناب میاں محمد طفیل صاحب ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی شام کو سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۳ کے تحت گرفتار کر لئے گئے اور دوسری صبح مولانا امین احسن صاحب اصلاحی بھی نظر بند کر لئے گئے۔ اور ڈیڑھ سال نظر بند رہنے کے بعد جون ۱۹۵۰ء کو وہ رہا کر دیئے گئے۔ نظر بندی کے زمانے میں مولانا عبدالجبار صاحب غازی امیر جماعت اسلامی کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ غازی صاحب چونکہ جناب مودودی صاحب کی نیابت میں خود انہی کی تیار کردہ لائنوں پر کام لے رہے تھے اسلئے ہم نے اس نظر بندی کے زمانے میں جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کا مودودی صاحب

کی طرف نسبت دی ہے۔ اس مختصر سی گذارش کے بعد اب آئیے "اسلامی تحریک" کے اصل نقوش! اس دلچسپ سرگذشت کے آئینہ میں ملاحظہ کریں۔

قرار دادِ مقاصد کا حال

مطالبۂ نظامِ اسلامی کی شورشوں اور یلغاروں کے زمانہ میں پاکستان کی ایک کافی آبادی پر مودودی صاحب اور ان کی جماعت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے جلسوں اور منظم پراپیگنڈا نے تو بس یہ اثر جما رکھا تھا کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے سب سے بڑی روک خود پاکستان کی دستور ساز اسمبلی ہے جس نے ابھی تک دستورِ اسلامی کی منظوری کا قانونی اعلان نہیں کیا۔ اگر یہ اعلان کر دیا ہوتا تو جماعت اسلامی اسلامی انقلاب برپا کرنے کی منظم کوششیں شروع کر چکی ہوتی مگر حیران کن بات یہ ہے کہ وہ "مقدس" قرارداد جس سے حکومتیں "مسلمان" بنتی ہیں اور حکومت اسلامی کے عملاً قائم ہونے کے راستے کھلتے ہیں۔ جب ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاس کر دی گئی تو اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے جناب مودودی صاحب اور ان کے رفقاء نے اسے پاکستان کے لیڈروں کو بدنام کرنے کا حربہ بنا لیا اور اپنے سیاسی اقتدار کے لئے جال بنا کر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ابتداء میں تو عملی کیفیت کچھ پوشیدہ رہی مگر تین ماہ بعد ان کے مخفی ارادے زبانوں پر آگئے :-

"افسوس ہے کہ پاکستان میں بلکہ دنیائے
اسلام میں اسلامی قانون کا سب سے بڑا ماہر
جس کا منصب یہ تھا کہ اسے **پاکستان کا**
گورنر جنرل بنایا جائے آج آہنی سلاخوں
میں ہے۔ میری مراد علامہ مودودی سے ہے"

(تسنیم بحوالہ الفضل ۱۵ جون ۱۹۴۹ء)

مودودی صاحب کے گورنر جنرل بنانے کا پراپیگنڈا کرتے ہوئے بڑی بے تابی کے ساتھ یہ امیدیں باندھنی شروع کیں ؎

جو صالحین سیاست بدر ہیں برسوں سے
وہ لیکے ہاتھ میں اب الکتاب اُبھریں گے
خدا کے اذن کے کچھ منتظر سپاہی ہیں
کھڑے ہیں آج پا در رکاب اُبھریں گے
گھڑی وہ دور نہیں جبکہ آپ کے مقتول
جفا رکا آپ سے لینے حساب اُبھریں گے

(کوثر ۱۱ رنومبر ۱۹۴۹ء)

۱۹۴۹ء کا سارا سال انہی آرزوؤں میں گزرا۔ اگلے سال کے آغاز سے انقلابِ قیادت کا نعرہ لگا کر پبلک کو یہ بتانا شروع کیا گیا :-

"اس طرح کی تبدیلیاں جن کا تقاضا اسلام کرتا ہے اگر عملاً ایک دو فردیں نہیں بلکہ چند سو اور چند ہزار افراد کی ٹیم کے اندر پیدا ہو سکیں تو پھر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی ہاتھوں کو بدلنے کی خواہشمند کبھی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر ایک پوری ٹیم فرنگی نظام کو چلاتے چلاتے یکایک اسلامی نظام کو چلانے کی قابلیتوں سے متصف نہ ہو سکے جو عملاً ناممکن ہے تو آخر ان ہاتھوں میں وہ کون سا عقدہ موجود ہے جس کے پیشِ نظر نظام کار انہی کے قابو میں چھوڑی جانی لازم ہے"

(ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۰ء)

پھر کہا :-

"جماعت کی اپنی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ فاسد قیادت کو صالح قیادت سے بدلے وہ اپنے لئے کسی طرح اس بات کو جائز نہیں سمجھتی کہ زندگی کے سارے معاملات تا قیں

کے ہاتھوں میں رہی اور وہ گوشۂ خمول میں پڑی رہی ہے۔ اگر ذمہ داری کو ادا کرنے کی وجہ سے اس پر جاہ پسندی کا الزام عائد کیا جائے تو یہ بہرحال اس کام کے کرنے والوں پر ہمیشہ عائد کیا ہی جاتا رہا ہے۔ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون کی دعوتِ انقلاب کو سن کر **فرعون** نے بھی یہی کہا تھا۔" (ایضاً ص۳۵)

اسی طرح جماعت اسلامی کی اصل شکل کو یوں ظاہر کیا:۔

> "جماعت اسلامی بجز دین کو لیکر اٹھی ہے اور وہ اس میں غیر دین کی ذرا برابر آمیزش کی بھی روادار نہیں ہے۔ لیکن اس کا دین **ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک سیاست ہے** اور کہیں بھی سیاست سے الگ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ ایک ایسی سیاست کی علمبردار ہے جو ہمہ تن دین ہے۔" (ترجمان القرآن اپریل ۱۹۵۰ء ص۱۶)

پنجاب کے انتخابات

جماعت اسلامی بڑے جوش سے ان خیالات کی اشاعت کر رہی تھی کہ ۲۸ مئی ۱۹۵۰ء کو مولانا مودودی صاحب اپنے رفقاء سمیت بیس ماہ کی نظر بندی کے بعد رہا ہو گئے۔ رہائی سے پیشتر آپ کی جماعت حتی الامکان اپنے پورے وسائل اور پوری قوت سے الیکشن میں اپنی شرکت کیلئے موزوں فضا تیار کر چکی تھی اور اب صرف مولانا صاحب کا انتظار ہو رہا تھا کہ وہ آئیں اور زمام اقتدار کی خاطر اپنے حواریوں سمیت جہاد کی کوشش کر دیں۔ سو اب آپ بھی تشریف لے آئے۔ مولانا نے آتے ہی حالات کا جائزہ لیا۔ اور ۱۴ جون ۱۹۵۰ء کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے ۱۹۵۱ء میں آنے والے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور وسیع پیمانے پر یہ اعلان شائع کر دیا گیا:۔

> "پنجاب کے انتخابات میں ہم پوری قوت سے شریک ہوں گے اور اس بات کی کوشش کریں گے کہ زیادہ سے زیادہ صالح لوگ منتخب ہوں۔" (ترجمان القرآن جولائی ۱۹۵۰ء)

ناظرین کو یاد ہوگا کہ ہندوستان سے آنے کے بعد آپ نے معاشرہ کی عدم تربیت کے باوجود مطالبۂ نظام اسلامی کو اپنی تمام کوششوں کا واحد مرکز بنا لیا تھا۔ مگر قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے کے بعد خود مودودی صاحب کو اس امر کا اقرار کرنا پڑا:۔

> "یہ ایک ایسی بارش تھی کہ نہ جس سے پہلے کوئی گھٹا تھی اور نہ جس کے بعد کوئی روئیدگی پیدا ہوئی ...... یہ قرارداد اس طرح پاس کی گئی ہے جس طرح ایک ہارا ہوا جواری اپنا آخری داؤ پھینکتا ہے۔" (ترجمان القرآن اگست ۱۹۵۰ء ص۲۱۳)

مولانا کے علم و فراست کا تقاضا یہ تھا کہ آپ اپنی اس ناکامی سے عبرت حاصل کرتے اور قید سے رہا ہونے کے بعد تو کم از کم اپنا رخ الیکشن اور اسمبلی کے راستوں سے پھیر کر سوسائٹی کی اصلاح کی طرف پھیر لیتے یا کسی شخص کی رائے پر عمل کرنے کی بجائے خود اپنی واقعات سے سبق حاصل کر لیتے جو آپ نے دس سال قبل علیگڑھ یونیورسٹی میں دہراتے ہوئے یوں بیان فرمائے تھے:۔

> "جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر نہ ہو کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر نہیں کیا جا سکتا۔ عمر بن عبدالعزیز جیسا زبردست فرمانروا جس کی پشت پر تابعین اور تبع تابعین

کی ایک بہت بڑی جماعت بھی تھی۔ اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے۔ کیونکہ سوسائٹی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ امون الرشید جیسا باجبروت حکمران نظام حکومت میں نہیں صرف اس کی ظاہری شکل میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں بھی ناکام رہا۔ یہ اُس وقت کا حال ہے جبکہ ایک شخص کی قوت بہت کچھ کر سکتی تھی۔"

اسمبلی میں صالح نمائندے کب آ سکتے ہیں

منددرجہ بالا واقعات کی روشنی میں آپ نے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"جمہوری حکومت کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں، اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو ان کے ووٹوں سے کبھی مسلمان قسم کے آدمی منتخب ہوکر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آ سکتے۔ اس قسم کے لوگوں میں اقتدار آنے کے یہ معنے ہیں کہ ہم اس مقام پہ کھڑے ہیں جس مقام پہ غیر مسلم حکومت میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر مقام۔" ("اسلامی حکومت کس طرح قائم ہو سکتی ہے" صـ۲۲)

یہ حقائق جو خود مودودی صاحب کی زبان سے نکلے ہوئے تھے انہیں اپنی خطرناک روش پر نظرثانی کرنے کی بار بار دعوت دے رہے تھے۔ مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ اب آپ سنہ ۱۹۴۲ء والے مودودی صاحب نہیں رہے تھے۔ جنھوں نے سیاست اور جماعت سے بے نیاز ہوکر واقعات اور دلائل کی روشنی میں اس صداقت کا کھلے بندوں اظہار کیا تھا۔ بلکہ اب آپ سنہ ۱۹۵۰ء کے جدید مودودی صاحب تھے جن کے ساتھ ایک بڑی جمعیت تھی۔ اور سیاست کا میدان انہیں قریب سے نظر آرہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا نے اس طرف کان دھرنا بھی گوارا نہ کیا اور ہزار سمجھانے کے باوجود "جماعت اسلامی کی جدوجہد" کے نام سے ایک پمفلٹ شائع کر دیا۔

انتخاب صالحین کے سبز باغ

یہ پمفلٹ کیا تھا بلند بانگ دعاوی کا ایک پلندا۔ جس میں آپ نے لکھا کہ:۔

"ہم انتخاب کے غلط طریقوں کی اصلاح کریں گے۔ صحیح اسلامی طریق کا مظاہرہ کیا جائے گا۔ اور اس مظاہرہ کا طریق یہ ہوگا۔

اوّل۔ ہم لوگوں کو بتائیں گے کہ خود امیدوار ہونا یا پارٹی ٹکٹ پہ کھڑا ہونا اسلام کے سراسر خلاف ہے۔

دوم۔ ہم صالح نمائندے منتخب کرنے کے لئے ہر جگہ پنچائتیں منعقد کرینگے۔ جو خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس بات کا فیصلہ کریں گی کہ ان میں صالح کون ہے؟

سوم۔ صالح کی یہ شرائط ہوں گی کہ وہ ذاتی اور اجتماعی حیثیت سے سچا مسلم ہو۔ اسلام کے جدید مسائل سے بخوبی آگاہی رکھتا ہو اور اسے عہدے کی غرض نہ ہو۔

چہارم۔ منتخب شدہ صالح نمائندوں سے

دیانتدارانہ طریق عمل اختیار کرنے کا حلف
لیا جائے گا۔ اور انہیں اجازت نہ ہوگی کہ
وہ الیکشن میں از خود پراپیگنڈا کر سکیں۔"

اس پروگرام کو صالحیت کا ذہنی لبادہ پہنانے کے لئے یہ بھی کہا گیا کہ:-

"ہمارے کارکن اس موقع پر تعلق باللہ
کا بھی مظاہرہ کریں گے۔" (ترجمان القرآن
جولائی، ستمبر ۱۹۵۰ء)

مودودی صاحب کے الیکشن بورڈ نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ کسی جماعت سے سمجھوتہ یا سودا نہ کرے گا سوائے اُن جماعتوں کے جو اس صالح طریق کار کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔[1]

اِن تمام امور کا پراپیگنڈا جس وسیع پیمانے پر کیا گیا وہ اپنی نظیر آپ تھا۔ جماعت کے سارے رسالے سارے اخبارات انہی مضامین سے بھرے ہوتے تھے۔ بلکہ اخبار قاصد کا ایک پورا نمبر اس کے لئے وقف کر دیا گیا تھا جس میں "خلافت راشدہ کے انتخابات" "صالح قیادت کے اوصاف" "انتخابات کے مروجہ طریقے" "الیکشن کی فریب کاریاں" "تبدیلی قیادت کے سوا کوئی چارہ نہیں" وغیرہ وغیرہ ایسے ولولہ انگیز مضامین شائع کئے گئے۔ غرضیکہ جماعت اسلامی کی پوری مشینری انتخابات کے لئے حرکت میں آ رہی تھی اور بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے ملک کی گذشتہ انتخابی فریب کاریوں کا طوفان مودودی صاحب اور انکے رفقاء کے ہاتھوں اپنا رُخ بدل لے گا اور الیکشن کے آغاز سے پہلے پہلے ملک کی ترتیبی صورت حال میں زبردست انقلاب آ جائے گا۔ اور جس لمحہ الیکشن کی کشتی کنارے پر لگے گی تو صالحیت اور صالح قیادت پوری شان سے جلوہ گر ہو جائے گی۔

[1] جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد صفحہ ۳۲

اسمبلی کی تمنائیں

ہمارے صالح بھائی الیکشن کی زیست گاہ میں کامیاب ہونے اور اپنے "صالح" ارکان کے صاحب اقتدار بننے کی کیا کیا تمنائیں دیکھ رہے تھے؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب بعض اخبارات نے ان کی شمولیت کے فیصلے پر تنقید کی تو جماعت اسلامی کے "صالح" آرگن نے یہ جواب دیا کہ:-

"جب سے جماعت اسلامی نے انتخابات
میں شرکت کا فیصلہ کیا ہے ان حلقوں میں
ایک قسم کی صف ماتم بچھ گئی ہے جو اسلامی
معیار انتخاب کی بنا پر دل ہی دل میں تسلیم
کرتے ہیں کہ ان کو انتخابات میں ایک ووٹ
کا حاصل ہونا بھی ممکن نہیں۔"
(کوثر یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اسی طرح برسر اقتدار طبقہ کو یوں چیلنج کیا جاتا تھا سہ

قرار داد مقاصد کو کھیل سمجھے ہو
یہ انقلاب سر وبال بن کے آئی ہے
الجھتے جاؤ گے جتنا کہ پھڑپھڑاؤ گے
تمہارے حق میں یہ اک جال بن کے آئی ہے
تم انقلاب قیادت سے روکتے ہو مجھے
ہم انقلاب قیادت میں لاکے چھوڑیں گے
(قاصد انتخابات نمبر صفحہ ۱۱)

پنچایتی نظام کا حربہ

یہ چیلنج، یہ دعاوی اور یہ اعلانات از خود پراپیگنڈا کے بہترین اسلحہ تھے مگر تمام سیاسی جماعتوں یا افراد کے خلاف جو انتخابات میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے تھے سب سے بڑا حربہ صرف ایک ہی استعمال ہو رہا تھا اور وہ یہ پنچایتی نظام صحیح اسلامی طریق انتخاب ہے جسے جماعت اسلامی اپنانے کی کوشش کرے گی مگر دوسری تمام جماعتیں یا افراد امیدواری کے کافرانہ طریق عمل کو اختیار کریں گے چنانچہ

اسی اہمیت کو نمایاں کرنے کے لئے جماعت اسلامی بڑے شد و مد سے یہ لکھ رہی تھی :-

"ان دو طریقہ ہائے انتخابات کی آپس کی کشمکش دراصل اشخاص کی کشمکش نہیں بلکہ یہ لڑائی خدا پرستی اور مادہ پرستی کے درمیان اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت کے درمیان سرمایہ دارانہ معیشت اور اسلامی اصولِ اقتصاد کے درمیان - مغربی فلسفہ اور قرآن و سنت کے درمیان - اسلام اور غیر اسلام کے درمیان برپا ہے"

(عزم جلد ا ص۱۲)

بلکہ اس سے بھی کھلے الفاظ میں اس کی طرف سے یہ کہا جا رہا تھا :-

"اس کی نگاہ میں آئندہ انتخابات اسلام اور جاہلیت یا صالحیت اور فسق کا ایک کھلا کھلا معرکہ ہوں گے - اس معرکہ میں فسق کو شکست دینے کے لئے صالحیت اور جاہلیت سے اقتدار سلب کرنے کے لئے اسلام کی پوری پوری حمایت و تائید نہ کرنا قوم سے دشمنی اور اسلام سے صریح غداری کا ہے" (ترجمان القرآن جلد ۴۳ ص۳)

معرکۂ انتخاب میں صالحین کے کارنامے

یہ وہ آخری الٹی میٹم تھا جن کے ساتھ

جماعت اسلامی پنچایتی نظام کے اڈے میں انتخابات کی طرف آگے بڑھی - زبانوں پر صالح "دستور انتخاب" کے کلمات جاری تھے - ہاتھوں سے انتخابی جد و جہد کا پیالہ تقسیم کرنے کا کام لیا جا رہا تھا اور ہونٹوں پہ تعلق باللہ کے اظہار کے لئے ایک خاص قسم کا تبسم عیاں تھا - یہ فضا دیکھ کر عوام سمجھے کہ اسلام کے نمائندے آ رہے ہیں - قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ "ووٹ کے عہد نامہ" پر دستخط کرانے کی مہم جاری ہے - یہ کھیل ختم ہی ہوا تھا کہ اسلامی دستور انقلاب کے مظاہرے کا وقت آ گیا - عوام نے جماعت اسلامی کے امر کا تیار کردہ پروگرام اپنے سامنے رکھا اور خیال کیا کہ اب پنچایتی نظام سے انتخاب کی باری شروع ہو رہی ہے - مگر ان کو یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوئی کہ پنچایتی نظام کو اسلامی نظام بنانے والے صلحاء نے یہ کہنا شروع کر دیا :-

"لوگو! ہم خود امیدوار نہیں ہیں کہ ذاتی اقتدار کے حصول کے لئے کوشش کریں ..... ہمارے دل اقتدار سے خالی ہیں البتہ قوم اگر کہے کہ تم یہ خدمت سرانجام دو تو ہم انکار نہ کریں گے"

(ترجمان القرآن ستمبر ص۲۲)

پھر نعیم صدیقی صاحب نے جماعت کی طرف سے یہ پیشکش کی :-

"اگر کسی حلقے کے صالحین بالاتفاق جماعت اسلامی پر اعتماد کریں اور اس سے کسی صالح کارکن کے نامزد کرنے کا مطالبہ کریں تو جماعت بصیرت اور دیانت کے لحاظ سے بہترین کارکن فراہم کرنے کی کوشش کرے گی" (ایضاً)

اسلامی پنچایت کے انعقاد سے قبل ہی نامزدگی کی اس پیشکش نے معرکۂ کفر و اسلام میں اسلام کی نمائندگی کرنے والوں کی اصل کیفیت عریاں کر دی اور (قامت دین) کی تحریک کے داعیوں کے قول و عمل کے اس تناقض نے عوام کی ساری امیدوں کا خون کر دیا - ابھی حیرت اور تاسف کی یہ کیفیتیں طاری تھیں کہ عوام نے دیکھا

کہ جن پنچایتوں کے نام پر صالح قیادت کا سبز باغ دکھایا جا رہا تھا ان کی برکت بن رہی ہے کہ ہر شہر اور علاقے میں اپنی ڈھب کے چند آدمیوں کے اجتماع کو اسلامی پنچایت کا نام دیکر نمائندے منتخب کئے جا رہے ہیں - ہاں اتنی بات ان کے دیکھنے میں ضرور آتی تھی کہ نمائندوں کی زبان پر حلف نامہ کے الفاظ آخر دم تک بہرحال جاری رہتے تھے۔

اس کارروائی کے بعد جب نتائج سنانے کی نوبت آئی تو ان تریپن صالح نمائندوں کے علاوہ جنہیں ان پنچایتوں نے منتخب کیا تھا مندرجہ ذیل افراد کو بھی نمائندوں کی لسٹ میں گھسیٹ لیا گیا حالانکہ ان کا انتخاب کسی باقاعدہ منظم پنچایت نے نہیں کیا تھا۔

(۱) حکیم محمد اشرف صاحب (گوجرانوالہ حلقہ ۳)
(۲) محمد سلیم صاحب بی - اے (منٹگمری حلقہ ۱)
(۳) مولانا محی الدین صاحب (لاہور حلقہ ۱۲)
(۴) میاں غلام علی صاحب (ڈیرہ غازیخان حلقہ ۲)
(۵) حاجی قطب الدین صاحب (منٹگمری حلقہ ۴)
(پمفلٹ پنچایتی نمائندے - شائع کردہ ناظم نشر و اشاعت)

(یاد رہے ان تمام نمائندوں میں مودودی صاحب کے علاوہ جماعت اسلامی کے تمام سربرآوردہ حضرات شامل تھے) مولانا مودودی صاحب اس پنچایتی نظام کے ذریعہ کیوں صالح نمائندے منتخب نہ ہو سکے؟ یہ ایک ناقابل حل معمہ ہے راقم الحروف نے اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے مولانا نعیم صدیقی صاحب مدیر ماہنامہ "چراغ راہ"، حکیم محمد اشرف صاحب امیر جماعت اسلامی لائلپور بلکہ خود مولانا مودودی صاحب کی خدمت میں بھی خطوط لکھے تھے - جن کے جواب میں مولانا مودودی صاحب نے تو بس یہی فرمایا تھا کہ مجھے اصل حقیقت حال معلوم ہے تمہیں گھر بیٹھے اس پر غور و فکر کرنے کی بجائے اپنے انداز فکر کی اصلاح کرنی چاہیئے - حکیم محمد اشرف صاحب نے لکھا تھا ہو کے حلقوں سے مودودی صاحب نے نامزدگی کی استدعا کی تھی مگر آپ نے اسے رد کر دیا تھا - لیکن اسکے برعکس نعیم صدیقی صاحب نے یہ جواب دیا کہ پنچایتوں نے خود ہی آپ کو منتخب کیا تھا مگر خود ہی اس انتخاب کو واپس لے لیا - بہرحال یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ مودودی صاحب انتخابی نمائندے کیوں نہ بن سکے - اگر پنچایتوں نے آپ کا نام پیش ہی نہیں کیا تو مولانا کی صالحیت؟ اور اگر پیش ہوا مگر رد کر دیا گیا تو آپ نے صالح قیادت کو بروئے کار لانے کے اس سب سے بڑے ذریعے کو کیوں ٹھکرا دیا جو آپ کے نقطۂ نظر سے حضرت یوسفؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر کا مقدس اسوۂ حسنہ بھی ہے)

بہرحال صالح نمائندوں کا اعلان ختم ہوا - اب جماعت اسلامی نے پبلک کے سامنے اپنے نمائندوں کا تعارف کرانا شروع کیا اور اس "اسلامی ٹیم" کے کھلاڑیوں کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کی صالحیت کو رجسٹرڈ (Regestered) ثابت کرنے کے لئے دلائل کی بھرمار کر دی - مثلاً نمائندہ یونیورسٹی کے متعلق ناظم انتخابات جماعت اسلامی نے حلقۂ یونیورسٹی کے ووٹروں سے کہا:-

"چونکہ جماعت اسلامی نے ان کو مستحق قرار دیتے ہوئے منظور کر لیا ہے - لہذا میں امید کرتا ہوں کہ آپ بھی ...... تائید فرمائیں گے"

مسلم سرحدی صاحب نے اسکی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"پورا یقین ہے کہ یہ نمائندہ اسمبلی

میں اسلامی طرزِ فکر سے صوبہ کی تعلیمی حالت
بہتر بنانے کی کوشش کریگا۔ اور یقین کیوں نہ
ہو جبکہ یہ شخص چھ برس تک جماعت اسلامی جیسی
انقلابی اور ہمہ گیر تحریک کا قیّم رہتے ہوئے
اپنی انتظامی قابلیت اور ڈیڑھ سال تک
مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے ساتھ ...
... ثبوت دیا۔" (ترجمان یکم مارچ ۱۹۵۱ء)

اسی دوران میں مجلس عمل مرکزی پنچایت حلقہ یونیورسٹی لاہور کی طرف سے نمائندہ یونیورسٹی کے لئے یہ معیارِ علم پیش کیا گیا کہ:۔

"مولانا مودودی اور مولانا امین احسن
اصلاحی سے قرآن اور حدیث کا علم ملتان جیل
میں حاصل کیا۔"

غرضیکہ اسی انداز میں تمام امیدواروں کے تعارف پیش کئے جا رہے تھے کہ یکدم ہنگامۂ انتخاب کا بگل ہوا۔ اور وہ منتظر "سپاہی" جنہیں اسلامی پنچایتوں نے معرکۂ حق و باطل کے لئے تیار کر رکھا تھا فوراً میدانِ انتخاب میں آ گئے اور معدودے چند کے سوا سب اپنے معاہدوں اور جماعت اسلامی کی انتخابی تعلیمات کو بغل میں داب کر دوسرے امیدواروں کی طرح پراپیگنڈا کرنے میں مصروف ہو گئے اور لیلائے اقتدار سے ہمکنار ہونے کی آرزو میں سیاسی حیلہ سازیوں کا قریباً وہی مظاہرہ شروع کر دیا جو دیگر افراد یا جماعتیں انتخاب میں کامیاب ہونے کے لئے کر رہی تھیں۔ یہ پارٹ اس انداز سے ادا کیا گیا کہ اس کے اندر خود صالحیت بھی روپوش ہو گئی۔ یہ تو جانباز سپاہیوں کی حالت تھی مگر جماعت اسلامی دوسری طرف جس طریق پر پبلک کو اپنے حریفوں کے خلاف مشتعل کرنے اور اپنے امیدواروں کو ووٹ دلانے کیلئے زور آزمائی کر رہی تھی اس نے تو دنیا کے سیاسی پراپیگنڈا کا انتخابی ریکارڈ ہی توڑ دیا۔ پنجاب کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک چھوٹے بڑے پمفلٹوں، ٹریکٹوں اور اشتہارات کی بھرمار کر دی گئی۔ ان پمفلٹس اور اشتہارات میں جس اشتعال انگیز طریق سے پراپیگنڈا کیا جاتا تھا اس کا اندازہ صرف ایک پمفلٹ کے دو چار فقروں سے لگ سکتا ہے جو پنجاب میں قریباً ہر جگہ بکثرت تقسیم کیا گیا اور جس میں کہا گیا:۔

"ہمارے لیڈر سیفٹی ایکٹ کے چھرے
کے زور سے اپنا مکر چلا رہے ہیں۔ تین سال
سے عوام اس چھرے کے خلاف برابر چیخ
رہے ہیں لیکن یہ حضرات اسے نیام میں لینے
کی بجائے ابھی ابھی ترمیم کی سان پر اور
زیادہ تیز کر کے لائے ہیں۔ عوام کے شہری
حقوق کے لئے یہ ایک شدید خطرہ ہے۔"

سیاسی ہتھیاروں کے علاوہ مذہبی ہتھکنڈے جس بے دردی سے استعمال کئے گئے ان کا اندازہ لائلپور سے شائع شدہ ایک پمفلٹ کی مندرجہ ذیل عبارت سے لگائیے:۔

"اگر آپ دل سے چاہتے ہیں کہ خدا کے
پاکباز پیغمبروں کا مقصد پورا ہو تو اپنے
شہر کی اسلامی پنچایت کے منتخب نمائندوں
کو کامیاب بنانے کی سر توڑ جدوجہد کیجئے۔"

جماعت اسلامی کی عبرتناک شکست

جماعت اسلامی کے پراپیگنڈا اور اس کے نمائندوں کی زبردست کوششوں کو دیکھتے ہوئے یہ تصور بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کوئی ایک صالح نمائندہ بھی ہار جائے گا مگر ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

جماعت اسلامی کی تاریخ کا یہ باب کس قدر عبرتناک

ہے کہ انتخاب کا سیاسی ڈرامہ جماعت اسلامی کو سو فیصدی ناکامی کا پیغام دیکر ختم ہوگیا۔ چار سال کی مسلسل کوششیں بیکار ہوگئیں اور جماعت اسلامی کی باقاعدہ پنچایتوں کا ہر ایک نمائندہ بُری طرح ناکام ہوا۔ لاکھوں روپے بھی ضائع ہوگئے۔ قیمتی اوقات بھی رائگاں گئے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ قوم جس کی تربیت کا بہانہ کرکے اس قدر طوفان بپا کیا گیا تھا قرارداد مقاصد اور صالح پنچایتوں میں حلف اٹھاتے اور صالح نمائندوں کے حق میں ووٹ ڈالنے کے بعد بھی ویسی کی ویسی رہی بلکہ اکابرین جماعت اسلامی کو الیکشن نے یہ محسوس کرا دیا کہ وہ اس سے پیشتر قوم کی اخلاقی اور سیاسی حالت کا غلط اندازہ لگاتے رہے ہیں انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ:

> "الیکشن نے ہماری قومی، اخلاقی اور سیاسی حالت کو بھی بے نقاب کر دیا ہے اور پوری قوم کو بالکل برہنہ کرکے سامنے لاکر رکھ دیا ہے کہ اس قوم میں یہ یہ گندگیاں، یہ کمزوریاں، یہ بلائیں اور یہ بیماریاں موجود ہیں" (کوثر ۳ اپریل ۱۹۵۱ء)

انہیں اپنے گھر کی حالت بھی معلوم ہوگئی اور انہیں کہنا پڑا کہ:۔

> "جو جماعت اقامت دین کی جد و جہد کے لئے بنی ہو جیسی کہ جماعت اسلامی ہے اس کے ارکان میں جس درجہ کا نظم و ضبط اور سمع و اطاعت ہونا چاہیئے وہ بہت سے ارکان میں موجود نہیں ...... یہ کمزوری شدت کے ساتھ قابل اصلاح ہے۔ اطاعت امر اور تعاون کی کمی عملاً طور پر یہی معنی رکھتی ہے کہ ہم اپنے مقصد کی بجائے اپنے مخالفین کے مقصد کی خدمت بجا لا رہے ہیں۔" (روئداد مجلس شوریٰ ۵ تا ۱۹ اپریل ۱۹۵۱ء شائع کردہ مکتبہ مرکزی جماعت اسلامی پاکستان)

مودودی صاحب اصل روپ میں

اکابر جماعت اسلامی نے تو یہ کہا ہے کہ الیکشن نے پاکستان کے عوام کو برہنہ کر دیا ہے مگر بات تو یہ ہے کہ انتخابات نے عوام کی حالت کو ہی نہیں خود جماعت اسلامی کو بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ اور ان تمام سرگرمیوں اور عملی کارگذاریوں سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آگئی ہے کہ جناب مودودی صاحب علم و عقل کے تمام طریقوں کو پس پشت ڈال کر بھاگے چلے جا رہے ہیں اور صالح قیادت کے نام سے سیاست و اقتدار کی منزلیں طے کرنے میں مصروف ہیں۔

ان واضح حقائق کی موجودگی میں جماعت اسلامی کے قافلہ کی خوش فہمی[1] ملاحظہ ہو کہ وہ جناب مودودی صاحب کو اپنا امیر بناتے ہوئے یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اسی راہ پر چل رہے ہیں جس پر چلانے کے لئے تمام انبیاء علیہم السلام اور خصوصاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔ اور جس کے گم شدہ نقوش حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت سید احمد صاحب بریلوی جیسے بزرگوں نے اپنی ذاتی قوت و بصیرت سے نہیں بلکہ صرف خدا کے الہام سے ہندوستان میں قائم فرمائے تھے۔ ہم سالار کارواں سے نہیں خود کارواں سے کہتے ہیں کہ خدا کے لئے آپ "نظام باطل" کے موجودہ وسیع اور عالمگیر اقتدار اور تسلط کو دیکھیں۔ مودودی صاحب کے گذشتہ حفاظتی سامانوں کی بربادی کو ملاحظہ فرمائیں اور پھر ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ کیا الٰہی رہنمائی کے بغیر مودودی صاحب جیسے لاکھوں انسان بھی ان بڑھتے ہوئے

[1] تقریر مولانا مسعود عالم صاحب ندوی بر اجتماع جماعت اسلامی کراچی۔ کوثر ۲۸ نومبر ۱۹۵۱ء۔

طوفانوں کا رُخ پلٹ سکتے ہیں ؟

مودودی صاحب کا نظریۂ جہاد

معزز قارئین [illegible] صفحات میں ناقابلِ تردید حقائق کی روشنی میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ مودودی صاحب در اصل احمدیت کے نقال ہیں اور اُن کی تحریک کے نقش و نگار حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مرہونِ منت لیکن یہ یاد رکھنا از بس ضروری ہے کہ مودودی صاحب کی تحریک کے خدوخال کا نظارہ کرنے کے لئے تصویر کے دوسرے رُخ کو بھی دیکھا جائے جہاں مودودی صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے لٹریچر سے وسیع استفادہ کیا ہے وہاں اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس استفادہ کے ساتھ آپ نے اسلام اور قرآن کے نام کے ساتھ چند ایسے غیر اسلامی امور کا امتزاج بھی کر دیا ہے جن سے مودودی صاحب کی تحریک نے بالکل جدید شکل اختیار کر لی ہے۔ اور عوام کے لئے یہ سمجھنا بہت مشکل ہو گیا ہے کہ مودودی صاحب کی تحریک حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کے افکار اور خیالات کا عکس ہے۔ یہ امور اصولی حیثیت سے دو ہیں۔

اوّل :- نظریۂ جہاد۔

دوم :- مہدی کا تصور۔

ہم ذیل میں انہی دو مباحث کے متعلق قارئین کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

نظریۂ جہاد مودودی صاحب آجکل اسلام کے نظامِ جہاد کی کیا تعبیر کرتے ہیں؟ اس کے محرکات کیا ہیں؟ اس کے دلائل کیا ہیں؟ قرآن، تاریخ اور واقعات کی دُنیا میں ان دلائل کی کیا قیمت ہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ ان تمام امور پر ایک اجمالی روشنی ڈالیں۔ مگر مودودی صاحب کے موجودہ نظریۂ جہاد کے متعلق کچھ لکھنے سے پیشتر یہ بتا دینا ضروری ہے۔ کہ مودودی صاحب کا نظریۂ جہاد در اصل دو متضاد اور مختلف خیالات کا مجموعہ ہے۔ جنہوں نے سنہ ۱۹۳۹ء میں ایک نئے مکتبِ خیال کو جنم دیا ہے۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ ہم سب سے قبل انہی عقائد سے تعارف کروائیں جو آگ اور پانی کی طرح باہم متضاد ہونے کے باوجود ایک لمبے عرصہ تک آپ کے دماغ میں جاگزین رہے اور اس نقطۂ نظر سے موجود ہے کہ یہ دونوں صحیح ہیں اور قرآن مجید ان دونوں کی تائید کرتا ہے۔

جماعت احمدیہ کے مسلک کی ترجمانی ان میں سے پہلا نظریہ وہ ہے جسے مودودی صاحب نے اپنی تصنیف الجہاد فی الاسلام کے ابتدائی اور آخری صفحات میں پیش فرمایا ہے اور جو جماعت احمدیہ کے اس مسلک کی پوری پوری ترجمانی کرتا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو مدافعانہ جنگ کی اجازت دی ہے سیاسی اقتدار اور جارحانہ پالیسی کے تصورات اس کے نظامِ سیاست میں داخل ہی نہیں اور جناب مودودی صاحب نے الجہاد فی الاسلام کے ابتدائی حصہ میں اسی نظریہ کی تائید کے لئے قرآن مجید کی وہ تمام آیات درج کی ہیں جن میں جنگ کا ذکر پایا جاتا ہے مثلاً :-

(۱) اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا (حج ۶)

(۲) الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض (انفال ع)

(۳) وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (بقرہ ع ۲۴)

(۴) واقتلوھم حیث ثقفتموھم (بقرہ ع ۲۴)

(۵) وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ "

(۶) و یصدوا عن سبیل اللہ (انفال ع)

(۷) قاتلوا الذین لا یومنون باللہ (توبہ ۵)

(۸) فشرد بھم من خلفھم (انفال ۷)

(۹) براءۃ من اللہ ورسولہ (توبہ ع)

(۱۰) فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم "

(۱۱) فقاتلوا ائمۃ الکفر "

(۱۲) جاھد الکفار والمنافقین (توبہ ع)

(۱۳) انما جزآء الذین یحاربون اللہ (مائدہ ۵)

(۱۴) وما لکم لا تقاتلون (نساء ۱۰)

(۱۵) وان استنصروکم فی الدین (انفال ع)

مندرجہ بالا آیات سے مودودی صاحب نے مدافعانہ جنگ کا استنباط فرمایا ہے جس سے یہ بات روز روشن کی طرح کھل جاتی ہے کہ قرآن مجید کسی جارحانہ پالیسی کا روادار نہیں اور کم از کم قرآن مجید کی ان آیات میں سے کسی ایک آیت سے بھی اس نظریے کی تائید نہیں ہوتی۔

دوسرا نظریہ

مگر یہ عجیب بات ہے کہ مودودی صاحب نے ابتدائی آیات میں تو اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے مگر درمیان میں اپنی طرف سے "مصلحانہ جنگ" کے نام سے ایک دوسرا نظریہ بھی ایجاد کر دیا ہے۔ مصلحانہ جنگ مودودی صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"اسلام نے بدی کے استیصال اور بدکاری کے دفع و انسداد کے لئے یہ کارگر تدبیر بتلائی کہ منظم جہاد سے اور اگر ضرورت پڑے تو جنگ و قتال کے ذریعہ سے ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے اور ان کی جگہ عادلانہ و منصفانہ نظام حکومت قائم کیا جائے۔" (الجہاد فی الاسلام صـ۹۰)

"اسلام کی اشاعت میں تبلیغ اور تلوار دونوں کا حصہ ہے جس طرح ہر تہذیب کے قیام میں ہوتا ہے۔ تبلیغ کا کام تخم ریزی ہے اور تلوار کا کام قلبہ رانی۔" (صـ۱۳۵)

"اسلام کی اشاعت کو تلوار سے ایک گونہ تعلق مردود ہے۔" (صـ۱۳۱)

ایک ہی سانس میں اسلام و قرآن کے نام پر دو مختلف نظریات بے حد حیران کن ہیں۔ مگر اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ مولوی صاحب جہاں مدافعانہ جنگ کے متعلق قرآن مجید کی آیات سے استنباط کرنے ہوئے کامیاب نظر آتے ہیں وہاں ہزار دوڑ دھوپ کی کوششوں کے باوجود آپ کو قرآن سے کوئی ایک بھی ایسی آیت نہیں مل سکی جو اس خیال کی تردید کرے کہ بزور شمشیر عادلانہ نظام قائم کر دینا جہاد ہے۔ اس لئے درست دیانت کے عالم میں حق و انصاف کا تقاضا تھا کہ مولانا مصلحانہ جنگ کی جدید اصطلاح کو صرف اپنی طرف منسوب کرتے اور خاموش ہو جاتے۔ مگر سنگدلی کی انتہا ہے کہ مولانا نے قرآن کو اپنا مخالف پا کر یا تو وہ آیات جو مدافعانہ جنگ کی لسٹ میں شامل کر لیا ہے جو اس سے قبل آپ مدافعانہ جنگ کی تائید میں پیش فرما چکے تھے اور یا پھر محض تبرک کے طور پر چند ایسی آیات نقل کر دی ہیں جو آن کی خانہ ساز اصطلاح بلکہ جنگ کے احوال سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتیں۔

وہ آیات جنہیں جناب مودودی صاحب نے اپنے خیالات کے تابع کرنے میں پورے پورے تشدد سے کام لیا ہے مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (آل عمران ع)

(۲) وجعلناکم امۃ وسطاً (بقرہ ع)

(۳) وجاھدوا فی اللہ حق جھادہ (حج ۱۰)

(۴) ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ (حج ۲)

(۵) ولا تجادلوا اھل الکتٰب الا بالحق (عنکبوت ع)

(۶) فقولا لہ قولاً لیناً (طٰہٰ ع)

یہ وہ آیات ہیں جن کو مولانا نے "مصلحانہ جنگ" کی نذر کر دیا ہے۔ حالانکہ کوئی معمولی پڑھا لکھا انسان بھی یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر، جہاد فی اللہ، حکمت، موعظہ حسنہ، حق اور قول لین کے الفاظ میں دنیا کو بزور شمشیر زیر نگیں رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر مولانا اپنے زور قلم سے یہ استدلال فرماتے ہیں کہ مسلمان کو چاہیئے کہ بزور شمشیر عادلانہ نظام قائم کر دے۔

اسی پر اکتفا نہ کر کے آپ نے علم تاریخ پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"تمام ہمسایہ ممالک پر ظالم بادشاہ اور جابر امراء مسلط ہیں۔ عدل، انصاف، قانون کوئی چیز نہیں۔ بادشاہوں اور حاکموں کی چشم و ابرو کے اشاروں پر لوگوں کے حقوق پامال ہوتے اور عزتیں لٹتی ہیں۔۔۔ ۔۔۔ انسانی برادری کو اس ذلیل حالت میں مبتلا دیکھ کر وہ سرفروش جماعت کمربستہ ہوگئی۔ پہلے اس نے وعظ و تذکرہ سے کام لیا۔ کسریٰ عجم، قیصر روم، مقوقس مصر کو دعوت دی کہ اسلام کے قانون عدل و حق پرستی کو اختیار کرے۔ جب ان لوگوں نے اس دعوت کو رد کر دیا تو پھر مطالبہ کیا کہ حکومت و فرمانروائی کی مسند ان لوگوں کے لئے خالی کر دیں جو اس کے اہل نہیں۔ مگر جب اس مطالبے کو بھی رد کر دیا گیا اور اس کے جواب میں تلوار پیش کی گئی تو مٹھی بھر انسانوں کی اس بے سر و سامان جماعت نے بیک وقت عظیم الشان سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے۔" (الجہاد فی الاسلام صفحہ ۱۱۱)

خط کشیدہ الفاظ فن تاریخ سازی کا بہترین شاہکار ہیں جسے مودودی صاحب نے مصلحانہ جنگ کے جواز کے لئے از خود تیار کیا ہے۔ اور یہی شاہکار آپ کی "مصلحانہ جنگ" کی اصل بنیاد ہے جس پر آپ نے اپنے جدید محل کی پوری عمارت قائم کی ہے۔ یہ بنیاد تاریخ کی روشنی میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اس کے متعلق آئندہ بحث کریں گے اس جگہ ہم صرف بتانا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب کی نگاہ میں مصلحانہ جنگ کیا چیز ہے؟ اور اس کے لئے آپ کیا دلائل پیش کرتے ہیں؟

"مصلحانہ جنگ" کے ساتھ چار عقائد

مصلحانہ جنگ کے تعارف کیلئے

یہ پیش نظر رکھنا لازمی ہے کہ آپ اپنے اس عقیدے کے ساتھ مندرجہ ذیل چار عقائد کو بھی شامل کئے ہوئے تھے۔

اوّل:۔ آپ کے نزدیک تحریک اسلامی روس کی اشتراکی پارٹی کی طرح ایک انقلابی تحریک تھی۔ آپ کہا کرتے تھے: "عموماً جہاں خرابیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں وہاں لوگ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں اور بگڑے ہوئے حالات سے جو تکلیف ان کو پہنچتی ہے وہ انہیں اتنی مہلت ہی نہیں دیتے کہ ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر کے اصلاح کی کوشش کریں۔ اسلئے ایسے حالات میں عام طور پر اصلاحی تحریکات کی بجائے انقلابی تحریکات کا زور ہوتا ہے ..... یہ سب کچھ اسلئے کیا گیا ہے کہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو بھی ایک انقلابی بحران کے برے نتائج ظاہر ہونے سے پہلے چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی

انقلاب پسند دونوں جماعتوں کو غور و فکر کی دعوت دیں۔" (ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۲ء بحوالہ تنقیحات صہ ۱۱۹)

دوم:۔ آپ یقین رکھتے تھے "اسلام قومی حکومت کا دشمن ہے۔ وہ ہر قوم کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے احوال کی اصلاح خود کرے مگر جب کسی قوم کے اعمال بگڑ جائیں، ان کی اخلاقی حالت خراب ہو جائے تو اسلام کے نزدیک اس قوم کو حکومت خود اختیاری کا حق باقی نہیں رہتا اور دوسرے لوگوں کو جو اسکے مقابلہ میں اصلح ہوں اس پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔" (الجہاد فی الاسلام صہ ۱۱۶)

سوم:۔ آپ اسلام کی جنگوں کو مدافعانہ اور مصلحانہ دو حصوں میں تقسیم فرمایا کرتے تھے۔

چہارم:۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لا تتمنوا لقاء العدو کے مطابق دشمن سے لڑائی کی تمنا کو ناجائز سمجھتے تھے۔ (الجہاد فی الاسلام صہ ۲۲۴)

خلاصہ:۔ یہ کہ جناب مودودی صاحب ابتداء میں مدافعانہ اور مصلحانہ جنگ کے عقیدہ کے ساتھ ان چاروں عقائد پر بھی جمے ہوئے تھے۔ اور کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ مودودی صاحب مصلحانہ جنگ کے اس نظریہ میں کوئی ترمیم فرمائیں گے مگر نظریاتی دنیا کا یہ انقلاب کس قدر عجیب ہے کہ آپ نے ان ابتدائی افکار و خیالات میں یکدم تبدیلی کر لی۔ یہ تبدیلی کیا تھی؟ اور اس کے محرکات کیا تھے؟ اس کی تفصیل ذیل کے الفاظ سے معلوم ہو گی۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی آمد

ان خیالات میں تبدیلی کا محرک یہ ہوا کہ مولوی عبید اللہ صاحب سندھی جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے بڑے لائق شاگرد تھے اسلام سے اسلام کا اشتراکی ایڈیشن تیار کر کے ترکی افغانستان اور دیگر ممالک اسلامیہ میں سے ہوتے ہوئے چوبیس سال کے بعد ۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو ہندوستان میں وارد ہوئے۔ مولوی صاحب کی آمد پر تمام اسلامی اداروں نے شاندار استقبال کیا۔ ایڈریس پڑھے گئے اور اُن سے توقع کی گئی کہ آپ ایک بزرگ اور عالم ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کو اسلام کے حقیقی تقاضوں سے آگاہی بخشیں گے۔ مگر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مولانا نے آتے ہی اشتراکیت کی طرح اسلام کو بھی ایک انقلابی مذہب قرار دیکر ان خیالات کی اشاعت شروع کر دی:۔

"عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگیں مدافعانہ تھیں جارحانہ نہ تھیں۔ عیسائی مبلغین (Missionaries) یہ پراپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ اسلام وحشیانہ مذہب ہے جس میں قتل و غارت اور خونریزی کے سوا کچھ نہیں۔ اس قسم کے پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر مسلمان علماء نے انیسویں صدی کے وسط سے یہ نظریہ پیش کرنا شروع کر دیا کہ اسلام کی جنگیں ہمیشہ مدافعانہ رہی ہیں اس نے کبھی جارحانہ حملہ نہیں کیا۔ مگر درحقیقت یہ رقیق عذر داری سے بڑھ کر نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسلام میں جنگ جائز ہے یا نہیں؟ اگر اسلام جنگ کو جائز قرار دیتا ہے تو اسکے بعد تو یہ افسر جنگ کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے کہ وہ خود آگے بڑھ کر حملہ کرے یا غنیم کے حملہ کی مدافعت کرے۔ ظاہر ہے کہ اسکا قرآن کے فیصلے سے کوئی تعلق نہیں۔" (قرآنی دستور انقلاب از عبید اللہ سندھی بار دوم صہ ۵)

کسریٰ اور قیصر کے ساتھ اسلامی جنگوں کی یہ تعبیر کی :-

"اس انقلابی تحریک کے پھیلنے کا علاقہ اصل میں عرب نہیں ہے۔ وہ قریش کے خلاف دشمنی اور جنگ کی تحریک نہیں ہے بلکہ انقلاب اس علاقے کے لئے ہے جو عرب کے مشرق اور مغرب میں واقع ہے۔ یعنی وہ اصل کسریٰ ایران اور قیصر روم کو قرآن کے قانون کے ماتحت لا کر اس تحریک کو تمام دنیا میں پھیلانا ہے ...... انسانیت صرف عدم تشدد یا مصلحت سے کبھی ترقی نہیں کرتی، ہمیشہ انقلاب سے بڑھتی ہے۔ جس کیلئے تشدد اور عدم تشدد دونوں ضروری ہیں۔"

مصلحانہ جنگ کے عقیدہ میں فوری ترمیم۔

یہ وہ خیالات تھے جن کی اشاعت مولانا عبید اللہ سندھی نے آتے ہی جاری کردی تھی۔ مولانا کی آمد ابھی بشکل ایک یا دو ماہ ہی گذشتہ ہوں گے کہ مودودی صاحب نے مئی ۱۹۳۹ء میں جہاد فی سبیل اللہ کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون لکھ ڈالا جس میں آپ نے اسلام کی مدافعانہ جنگ کے پہلو سے توبہ اختیار کر لی، مصلحانہ جنگ کی شکل میں ترمیم کر لی اور مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے خیالات کے ایک ایک جزو کی پر زور تائید کرکے تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ چنانچہ آپ نے مولوی عبید اللہ صاحب سندھی کے خیالات کی لفظاً لفظاً ترجمانی کرتے ہوئے لکھا :-

(۱) "ان کی (یعنی محققین اسلام) حالت قابل داد ہے کہ انہوں نے ہماری تصویر اتنی بھیانک اور اتنی بھدی بنائی کہ خود ان کی تصویر اس کے پیچھے چھپ گئی۔ اور ہماری سادہ لوحی قابل داد ہے کہ لگے معذرت کرنے کہ حضور بھلا ہم جنگ جدال کیا جانیں۔"

(۲) اسلام کو ایک انقلابی نظریہ بتاتے ہوئے کہا :-

"دراصل اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے جو تمام دنیا کے اجتماعی نظم (Sociel order) کو بدل کر اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق تعمیر کرنا چاہتا ہے اور مسلمان اس بین الاقوامی انقلابی جماعت کا نام ہے جسے اسلام اپنے مطلوبہ انقلابی پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے منظم کرتا ہے۔"

(۳) پہلے آپ کہا کرتے تھے کہ اسلام کی رو سے ایک ملک کا حق اقتدار صرف اس وقت دوسرے صالحین کے نام منتقل ہوتا ہے جبکہ ملک کی اخلاقی حالت بگڑ چکی ہو اور ان کا پرسان حال کوئی نہ ہو۔ مگر اب آپ کا درس یہ تھا کہ :-

"اسلام ان کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ اپنے کسی طریقہ پر حکومت کا نظام چلائیں جو اسلام کی نگاہ میں فاسد ہے۔"

(۴) مدافعانہ جنگ کو سرے سے غلط قرار دیتے ہوئے صاف لکھا :-

"جنگ کی جو تقسیم جارحانہ اور مدافعانہ اصطلاحوں میں کی گئی ہے اس کا سرے سے اسلامی جہاد پر اطلاق ہی نہیں آتا ...... اسلامی جہاد بیک وقت جارحانہ بھی ہے اور مدافعانہ بھی۔"

(۵) اس سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث زبان پر رہتی تھی کہ مسلمانو! جنگ کی تمنا نہ کرو۔ مگر اب آپ نے مسلمان کو خدائی فوجدار کا خطاب دیا۔

ے کہا:-

"یہ مذہبی تبلیغ کرنے والے Preachers اور مبشرین (Missionaries) کی جماعت نہیں بلکہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے ..... لہٰذا اس پارٹی کے لئے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔"

(ترجمان القرآن مئی ۱۹۳۹ء)

یہ وہ حیرت انگیز تغیرات تھے جو مودودی صاحب کے گذشتہ افکار و خیالات میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی آمد پر یکایک رونما ہوگئے۔ یہ نئے خیالات اب ان کے اصل نظریۂ جہاد کا سرمایہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جناب مودودی صاحب نے اب اسلام کے مدافعانہ پہلو کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ اور اسلام کو بھی اپنے نظام سیاست میں اشتراکیت کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

گذشتہ تاریخی بیان میں تغیر

مودودی صاحب نے مصلحتاً جنگ میں ترمیم کرنے کے بعد جو نیا نظریہ اختیار کیا اس کے لئے آپ نے کوئی نئی قرآنی دلیل نہیں دی بلکہ مصلحتاً جنگ والی آیات تبرکاً رکھ دی ہیں۔ البتہ آپ نے اپنے گذشتہ تاریخی بیان میں جو تغیر کیا ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

"عرب میں جب یہ مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی سب سے پہلے اس کو اسلامی حکومت کے زیر نگیں کیا گیا جس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے ممالک کو اپنے مسلک کی طرف دعوت دی مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کردیا۔ آنحضرت صلعم کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انھوں نے روم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومت پر حملہ کیا اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حملے کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا۔" (جہاد فی سبیل اللہ صفحہ؟)

قارئین! اگر آپ نے بیان کے ساتھ وہ بیان پڑھیں جو ہم نے الجہاد فی الاسلام کے صفحہ سے نقل کرکے اوپر درج کیا تھا تو آپ ان میں ایک خوفناک تضاد محسوس کریں گے۔

پہلے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیصر و کسریٰ اور دیگر غیر اسلامی ممالک کو سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی گئی۔ اور جب ان کی طرف سے یہ دعوت رد کر دی گئی تو پھر یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ ان لوگوں کو مسند اقتدار سونپ دیں جو اس کے اہل ہوں۔ (یہ نہیں کہ صرف مسلمانوں کو سونپ دیں) اسی طرح پہلا بیان یہ بتاتا ہے کہ اسلام کی دعوت کے مقابلے پر جب انھوں نے تلوار پیش کی تو مسلمانوں نے تلوار کا جواب تلوار سے پیش کیا اور ان کی حکومت پر قبضہ کرکے پامال شدہ انسانوں کو آزادی بخشی۔

لیکن اس کے برعکس دوسرے بیان میں ان تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ایک ہی بات کہی گئی ہے کہ روم و ایران کی حکومتوں کو صرف اسلام کی دعوت دی گئی تھی اور اس بات کا انتظار کئے بغیر کہ اس دعوت کا کیا جواب ملتا ہے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی فوجوں نے چمکتی ہوئی تلواروں سے ان سب کو تہس نہس کرکے قبضہ کر لیا تھا۔ اور قبضہ کی اصل وجہ انسانیت کی پامالی نہیں تھی بلکہ صرف اور صرف یہ وجہ تھی کہ

اب مسلمان نہتا اور مظلوم نہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار آ چکی تھی اور یہ مذہب کی تبلیغ کرنے والے اور مبشرین کی جماعت نہیں تھی بلکہ سپاہی تھی۔ یعنی ریزداروں کی جماعت تھی لہذا اس پارٹی کے لئے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

مودودی صاحب مخالفینِ اسلام کی صف میں

یہ ہے وہ نظریہ جہاد جسے مودودی صاحب آج کل تحریکِ اقامتِ دین کے امیر ہونے کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اور ارکان اور متفقین اس وعظ کو سنتے اور سر دھنتے ہیں۔ مگر انہیں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ مودودی صاحب جب تک حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تحریرات کے مقلد بنے رہے ان کا مقام ایک معقول انسان کا مقام رہا۔ مگر جس دن آپ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے واضح مسلک کو چھوڑنے کی کوشش کی وہیں انہیں اسلام کے ان شدید دشمنوں کی صف میں آنا پڑا جو اپنے بدباطنی اور ذاتی تعصب کی بنا پر اسلام پر یہ اتہام لگا رہے تھے کہ:۔

"اور محمد کے جنرل ایک ہاتھ میں
قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار
لے کر تلقین کرتے تھے۔" (ڈوزی
بحوالہ تحقیق الجہاد مصنفہ اعظم یار جنگ)

"آپ ایک ہاتھ میں تلوار اور
دوسرے میں قرآن لیکر مختلف اقوام
کے پاس جاتے ہیں۔" (مسٹر باسورتھ سمتھ
بحوالہ تحقیق الجہاد مصنفہ اعظم یار جنگ)

"جب آپ کی جمعیت بڑھ گئی تو آپ
نے دعویٰ کیا کہ مجھے ان پر حملہ کرنے اور
بزورِ شمشیر بت پرستی مٹا کر دینِ حق
کے قائم کرنے کی اجازت منجانب اللہ
مل گئی ہے۔" (جارج سیل بحوالہ تحقیق الجہاد
مصنفہ اعظم یار جنگ)

"اہلِ عرب نے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے
ہاتھ میں تلوار لیکر جلتے ہوئے شہروں کے شعلوں
اور تباہ و برباد شدہ خاندانوں کی چیخ پکار کے
درمیان اپنے دین کی اشاعت کی۔" (میجر آبرن
بحوالہ کتاب Critical Exposition
of the Papular Jihad)

کس قدر درد انگیز ہے یہ نظارہ کہ مودودی صاحب اسلام کی مدافعت کرنے کی بجائے مخالفینِ اسلام کے قدم مضبوط کر رہے ہیں۔ بلکہ انہیں اسلام کے خلاف اسلحہ فراہم کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ اسلئے کیا جا رہا ہے کہ کسی طرح آپ کے نظریہ جہاد کی تائید ہو سکے۔ اور روم و ایران کی جنگوں کے متعلق آپ تاریخی طور پر جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ درست تسلیم کر لیا جائے۔ حالانکہ روم اور ایران کی حکومتوں پر مسلمانوں کے جارحانہ اقدامات کا دعویٰ صحیح اور معتبر تواریخ کی روشنی میں کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

رومی جنگیں تاریخ کی روشنی میں

ہم سب سے پہلے رومی جنگوں کو لیتے ہیں۔ تاریخ اسلام اس بات پر شاہد ہے کہ سلطنتِ روم کے ساتھ مسلمانوں کا سب سے پہلا تصادم غزوہ موتہ کے موقع پر ہوا۔ اور یہ کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتا کہ اس تصادم کی وجہ یہ تھی کہ مسلم پارٹی اپنی طاقت کے نشے میں مخمور ہونے کے بعد رومن حکومت کے تختہ کو الٹنے کے لئے مجبور ہو گئی تھی۔ بلکہ اس کے صریح خلاف ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ خود مملکتِ روم نے بیکس اور مظلوم مسلمانوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی حفاظت اور اپنی ریاست کی حفاظت کے لئے میدانِ جنگ میں آئیں۔ ورنہ ان کے

پروگرام میں کوئی ایسی تجویز موجود نہ تھی جس کے مطابق وہ اپنا نظام تلوار کی نوک سے قائم کرنا چاہتے تھے۔

چنانچہ یہ تاریخ کا ایک کھلا ورق ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد رؤسا اور سلاطین کو حق و صداقت کی طرف دعوت دینے کے لئے جو خطوط ارسال فرمائے تھے اُن میں سے ایک خط حضرت حارثؓ بن عمیر ازدی کے ہاتھ حاکم بُصریٰ کے نام بھی روانہ کیا تھا۔ حضرت حارثؓ ابھی بُصریٰ تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ قیصر روم کے صوبیدار شرحبیل بن عمر غسانی نے ملکی قوانین کو نظر انداز کر کے ان کو گرفتار کر لیا۔ اور یہ دیکھ کر کہ آپ مسلمان ہیں اور رسول اللہ کا دعوت نامہ لئے جا رہے ہیں اس بدبخت نے بیدردی سے انہیں شہید کر دیا۔

اس شہادت کی زہرہ گداز خبریں جب مدینہ میں پہنچیں تو حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفاکی اور سنگدلی کے خلاف عملی اقدام کرنے کے لئے جمادی الاوّل ۸ ہجری میں حضرت زیدؓ بن حارثہ کی سرکردگی میں تین ہزار کا لشکر روانہ فرمایا۔ ہندوستان کے مشہور اسلامی مؤرخ علامہ شبلی مرحوم اس موقع پر لکھتے ہیں:-

"شرحبیل نے ان کو قتل کر دیا ان کے قصاص کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار فوج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی" (سیرۃ النبی جلد اوّل صفحہ ۲ ایڈیشن دوم مطبع معارف اعظم گڑھ)

تاریخ کی معتبر کتاب طبری میں یہ بھی لکھا ہے کہ لشکر جب شام میں پہنچا تو اس نے یہ خبر سُنی کہ قیصر روم نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے ایک لاکھ فوج قریب ہی تیار کر رکھی ہے علامہ ابن جریر کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

"ثم مضوا حتّٰی نزلوا معان من ارض شام فبلغ الناس ان هرقل قد نزل مآب من ارض البلقاء فی مائة الف من الروم" (طبری جلد ۲ صفحہ ۳۱۹ مطبوعہ الاستقامیہ مصر)

یہ وہ آتش تھا جس نے قیصر روم میں غزوۂ موتہ کے بعد اسلامی ریاست کے ختم کرنے کا جنون سا پیدا کر دیا چنانچہ قیصر نے شام کے غسانی خاندان کو محض اس کام کیلئے متعین کیا کہ وہ مسلمانوں کے ختم کرنے کی سازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ بخاری[1] سے ثابت ہے کہ ان دنوں غسانیوں کے حملہ آور ہونے کی خبریں مدینہ میں اکثر گرم رہتی تھیں۔

آخر جب دوسرے سال شام کی سرحد پر قیصر کی عیسائی فوجوں کا زبردست اجتماع ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ خبر سُن کر اپنے صحابہ کے ساتھ مدافعت کی غرض سے تبوک تک تشریف لے گئے۔ اور گو قیصر روم اور غسانی سپاہیوں کو میدان میں آنے کی جرأت نہ ہوئی مگر اس مرعوبیت نے آتش انتقام کو شعلہ جوالہ میں بدل دیا۔ اسی سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے آخری لمحات میں انہوں نے شام اور فلسطین کی سرحدوں پر شورش پھیلانی شروع کی۔ ان تشویشناک خبروں کے موصول ہونے پر حضورؐ نے ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا اور حضرت اسامہ بن زیدؓ اس کے لئے بطور کمانڈر نامزد ہوئے۔ لشکر روانہ ہونے والا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ حضرت ابو بکرؓ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو آپؓ نے اس لشکر کو روانہ کر دیا اور پھر ایک مسلسل کشمکش کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قیصر کا آفتاب حکومت اپنی نالائقیوں سے غروب ہو گیا۔

ان واقعات کی موجودگی میں ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قیصر گورنمنٹ کے ساتھ

---

[1] بخاری ذکرو فد ایلاء۔

جو تصادم شروع ہوا وہ اس نظریہ پر مبنی نہیں تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یا آپ کے صحابہ کرامؓ بزورِ شمشیر نظامِ حق قائم کرنا چاہتے تھے بلکہ خود قیصرِ گورنمنٹ نے اسلامی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کر کے مسلمانوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی جان اور ریاست کی حفاظت کے لئے آگے بڑھیں۔ خود مولانا مودودی صاحب نے ۱۹۵۲ء میں اس حقیقت کا اعتراف فرمایا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:-

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بلاشبہ صورتِ حال یہی ہے کہ ہر جنگ کے اسباب کفار ہی نے مہیا کئے۔" (ترجمان القرآن نومبر ۱۹۵۲ء)

تصادمِ ایران کا تاریخی پس منظر

تاریخی نقطۂ نظر سے ایرانی حکومت سے چپقلش کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے خطوط کے ساتھ شہنشاہِ ایران خسرو پرویز کو دعوت نامہ بھجوایا تو خسرو پرویز نے آپ کے نامۂ مبارک کو پھاڑ ڈالا اور حقارت آمیز لہجہ میں کہا "یکتب الی ھذا وھو عبدی" (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۶ مطبوعہ الاستقامہ مصر) یعنی میرا غلام ہو کر ایمان لانے کی دعوت اور تلقین کرتا ہے۔" اس کے ساتھ ہی اپنے غیظ و غضب سے بے تاب ہو کر اس نے گورنر یمن باذان کو شاہی فرمان بھیجا کہ اس نئے مدعیٔ نبوت کو میرے دربار میں پیش کرو۔ باذان نے بابویہ اور خرخسرہ دو اشخاص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا۔ ان دونوں نے جن الفاظ سے کسریٰ کا پیغام پہنچایا اس سے خسرو پرویز کی عرب دشمنی اور خصوصاً اسلام دشمنی کا پورا پورا اندازہ لگ سکتا ہے۔ انہوں نے کہا:-

"و قد بعثنی الیک لتنطلق معی فان فعلت کتب مَلِکُک الی ملک الملوک ینفعک و یکفہ عنک و ان ابیت فھو من قد علمت فھو مھلکک و مھلک قومک و مخرب بلادک۔" (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۶)

یعنی اگر آپ شہنشاہ کی حکم عدولی کریں گے تو وہ آپ کی قوم، ملک اور خود آپ کو (خاکم بدہن) تباہ و برباد کر دیگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا سے خبر پا کر یہ اطلاع دی کہ گستاخ خسرو پرویز آج رات میرے خدا کے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ چنانچہ بعد میں جب گورنر یمن کو شیرویہ کی طرف سے اس خبر کی تصدیق ہو گئی تو وہ مسلمان ہو گیا۔ خسرو پرویز کے قتل کے بعد شیرویہ، اردشیر اور کئی نو عمر لڑکے اور لڑکیوں کے تخت نشین ہونے کے بعد جب یزدجرد سریر آرائے اقتدار آیا تو اس وقت خلافتِ اولیٰ کا آغاز تھا۔ اندرونی طور پر بے شمار فتنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور بیرونی طور پر ہرقل اور دوسرے دشمنوں سے سلطنتِ اسلام کچھ متزلزل سی ہو رہی تھی۔ ان نازک حالات میں یزدجرد نے خسرو پرویز کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی فوجیں عراق میں جمع کرنی شروع کر دیں۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے ایرانی حکومت کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے قادسیہ کی طرف فوجیں بھجوا دیں[1]

یہ تمام حالات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مودودی صاحب نے یہ کہہ کر انصاف کا خون کر دیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایرانی حکومت کے ساتھ جو تصادم شروع کیا تھا وہ ایک جارحانہ حملہ تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح یزدجرد کے ہاتھ سے

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ اسلام مصنفہ اکبر شاہ نجیب آبادی۔

اقتدار چھین لیا جائے اور صالحین ایران پر قابض ہو کر نظامِ اسلامی کو قائم کر سکیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اعلانِ حق

اس موقع پر یہ بات بے حد حیران کن ہے کہ مودودی صاحب کی نگاہ میں تو چھوٹے سے چھوٹا مسلمان اُمّتِ وسطیٰ اور خدائی فوجدار ہونے کی حیثیت سے اس بات کا ذمہ دار ہے۔

اوّل: "کفر اور کافرانہ نظامِ زندگی کا وجود خود ایک مستقل سبب جہاد ہے اور جب تک یہ دنیا میں باقی ہیں اگر شرائط و حالات بہم ہوں تو مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ چین کی نیند سو سکیں۔" (ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۸)

دوم: "اسلام ان کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ اپنے کسی طریقہ پر حکومت کا نظام چلائیں جو اسلام کی نگاہ میں فاسد ہے۔" (جہاد فی سبیل اللہ)

سوم: "اس پارٹی کے لئے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔" (ترجمان القرآن مئی ۱۹۳۹ء)

مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقدس خلیفہ رسول جس کے ہاتھ سے ایران کی حکومت پاش پاش ہوئی اسلام کے اس نظریۂ فوجداری سے بالکل بے خبر تھے کیونکہ مودودی صاحب کے نقطۂ خیال سے تو آپ کا یہ فرض تھا کہ آپ اُس وقت تک لڑائی کرتے چلے جاتے جب تک کہ دُنیا بھر میں نظامِ حق قائم نہ ہو جاتا۔ مگر آپ نے تو آگے بڑھنے کی بجائے ایرانی جنگوں کے متعلق کئی دفعہ اس خواہش کا اظہار فرمایا ہے کہ کاش ایران میں جانبین کی طرف سے لڑائی کی نوبت ہی نہ آتی۔ چنانچہ خراسان کی فتح کی خبر سن کر آپ نے ایک آہ بھری اور فرمایا:۔

"لوددت انی لم اکن بعثت الیها
جنداً ولوددت انه کان بیننا
وبینها بحر من نار" (طبری جلد ۳ صفحہ ۲۴۶)

اسی طرح جلولاء کی فتح کے موقع پر کہا:۔

"لوددت ان بین السواد و
بین الجبل سداً لا یخلصون
الینا ولا نخلص الیهم حسبنا
من الریف السواد" (طبری جلد ۴ صفحہ ۱۳۰)

یعنی میں تو یہ چاہتا تھا کہ ہمیں جو کچھ علاقہ مل چکا ہے اسی پر اکتفا کیا جاتا اور ایرانی فوجیں نہ ہمارے علاقے میں آتیں اور نہ ہم ان کے علاقے میں جاتے۔"

یہی نہیں اس سے بڑھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایران کے تصادم کے متعلق ایک فیصلہ کن اعلان بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ طبری جلد ۴ صفحہ ۱۸۱-۱۸۵ میں لکھا ہے کہ ایران کے مفتوح علاقے سے جب ایک وفد حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ آپ کے ہاں ابھی تک شورشیں کیوں اٹھتی ہیں؟ ثابت بن قیس جو اس وفد کے ایک ممبر تھے انہوں نے عرض کی کہ یا امیرالمومنین! آپ نے ایرانی بادشاہ کے مغلوب ہو جانے کے بعد مزید فوج کشی سے منع کر رکھا ہے۔ پس جب تک یہ فتنہ پرداز ایران میں موجود رہے گا کسی نہ کسی فتنہ کا اُٹھتے رہنا ضروری ہے۔ اس کے بعد کہا:۔

"وقد رأیت انا لم نأخذ شیئاً
بعد شیء الا بانبعاثهم ولا یزال
هذا دأبهم حتی تأذن لنا
فلنسیح فی بلادهم حتی نزیله

عن فارس ونخرجه عن مملکته"

یعنی آپ جانتے ہیں ہم نے ایران پر جارحانہ حملہ نہیں کیا بلکہ ہر دفعہ ایرانیوں کی طرف سے پہلے لشکر کشی کی گئی اور یہ لشکر کشی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ آپ ہمیں یزدجرد کو ایران کی پوری سرحدوں سے باہر نکال پھینکنے اور اسکے ملک پر قبضہ کرنے کی اجازت نہ بخشیں گے۔"

حضرت عمرؓ نے یہ سُن کر جواب میں فرمایا :-

"صدقتنی واللہ"

خدا کی قسم تم نے ان الفاظ سے میری پوری پوری تصدیق کردی ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس باطل شکن بیان کو پڑھکر اب دُنیا خود فیصلہ کر سکتی ہے کہ جنگ ایران اور نظریۂ جہاد کی حقیقت وہ ہے جو خلیفۃ الرسول حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی لشکر کے کمانڈر انچیف ہونے کی حیثیت سے بیان فرمائی تھی یا وہ جو چودہ سو سال بعد پیدا ہونیوالے مودودی صاحب اب پیش فرما رہے ہیں ؟

لمحۂ فکریہ بہرحال تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بات چھپائے نہیں چھپ سکتی کہ مودودی صاحب اسلام کے نظامِ جہاد کو پیش نہیں فرما رہے ہیں بلکہ اسلام کے نام پر چند "صالح سکھ[1]" اور "صالح ہندو" پیدا کرنا چاہتے ہیں جو صالح قیادت کا نعرہ لگائیں اور دُنیا کی دولت، ذرائع اقتصاد و معیشت پر قابض ہونے کے سبز باغ دیکھتے رہیں اور تلوار کی نوک سے "نظامِ حق" کے قیام کا بہانہ لیکر سیاست اور اقتدار کی طرف بڑھ سکیں۔ اور دُنیا کی بدقسمتی ہے کہ یہ سب کچھ "اُمَّةً وَّسَطًا" کی عملی تفسیر بیان کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔

امامِ مہدیؑ کا تصوّر مودودی صاحب کی نظر میں!

نظریۂ جہاد کے متعلق عرض کرنے کے بعد اب ہم مودودی صاحب کے دوسرے نظریئے کو لیتے ہیں۔ یہ نظریہ مہدی کے تصوّر کے بارے میں ہے۔

مودودی صاحب نے الامام المہدی کے بارہ میں جو مسلک اختیار کیا ہے وہ نہ صرف انتہائی مضحکہ خیز ہے بلکہ اس میں آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح پیشگوئیوں اور روایات سے بھی گریز کیا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ آپ اس نئے طریق کو واجب العمل قرار دے کر اس کی پُر زور تبلیغ کر رہے ہیں۔ مودودی صاحب کے تصوّر کا مضحکہ خیز پہلو یہ ہے۔ آپ ایک طرف موجودہ دُنیا کی حالت کے پیشِ نظر یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ :-

"ہمارے سامنے ایک دُنیا ہے جو فسق و فجور سے بھری ہوئی ہے جس کے افکار و خیالات یکسر باطل اور اعمال و افعال یکسر نفس پرستانہ ہیں۔ خدا پر ایمان یا تو سرے سے موجود ہی نہیں یا موجود ہے تو اس میں صدہا رخنے ہیں۔ آخرت کو لوگ یا تو سرے کو مان ہی نہیں رہے یا مان رہے ہیں تو اس طرح کہ ان کا ماننا نہ ماننا دونوں برابر ہیں۔ اللہ، رسول، آخرت کا اقرار نہیں بلکہ انکار دین بن چکا ہے۔ اس دُنیا کے اندر تھوڑے مسلمان بھی جی رہے ہیں جو اس میں شبہ نہیں کہ

---

[1] سکھ اور ہندو یعنی دشمنانِ اسلام بھی صالح کہلا سکتے ہیں۔ (ترجمان القرآن اگست ۱۹۴۳ء)

اللہ کا نام بھی لیتے ہیں رسول کا دم بھی بھرتے ہیں اور آخرت کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن اس اعتبار سے دونوں یا بہی کہ عملی زندگی سے خدا اور رسول دونوں کو الگ رکھا ہے۔"
(ترجمان القرآن اگست وجولائی ۱۹۴۵ء)

انہیں یہ احساس بھی ہو دیا ہے :-

"تجدید دین کے لئے صرف علوم دینیہ کا احیاء اور اتباع شریعت کی روح کو تازہ کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ ایک جامع اور ہمہ گیر تحریک کی ضرورت ہے جو تمام علوم و افکار، تمام فنون و صناعات اور تمام شعبہ ہائے زندگی پر اپنا اثر پھیلا دے۔ اور تمام امکانی قوتوں سے اسلام کی خدمت لے۔ اور دوسرا سبق جو اس سے قریب الماخذ ہے وہ یہ ہے کہ اب تجدید کا کام فنی اجتہادی قوتوں کا طالب ہے محض وہ اجتہادی بصیرت جو شاہ ولی اللہ صاحب یا ان سے پہلے کے مجتہدین و مجددین کے کارناموں میں پائی جاتی ہے، اس وقت کے کام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی نہیں۔" (تجدید و احیائے دین ص۳۲)

آپ کے یہاں مہدی کا یہ مشن بھی مسلم ہے :-

"وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر پیدا کریگا۔ ذہنوں کو بدلے گا۔ اور ایک زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کریگا۔ جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اوج کمال پر پہنچ جائے گی۔" (تجدید و احیائے دین ص۳۲)

مگر ان تمام مسلمات کے باوجود آپ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ مہدی کے نام سے دین میں کوئی خاص منصب قائم ہے جس پر ایمان لانا اور جس کی معرفت حاصل کرنا ضروری ہے۔"

آپ یہ بھی سمجھتے ہیں اس مہدی کے ساتھ کوئی ایسی علامات نہ ہوں گی جن سے امتِ مسلمہ ان کی تلاش کر سکے۔ آپ کے خیال میں وہ خدائی الہامات، کشوف اور وحی سے بھی محروم ہوگا اور اسے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے اصلی منصب کا علم نہ ہوگا اور اس کی وفات کے بعد لوگ اسے اپنی عقل سے "دریافت" کریں گے۔

آپ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ مہدویت دکھائے جانے کی بات ہے دعویٰ کرنے کی بات نہیں ہے اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ بے عقلی کا ثبوت دیتے ہیں۔
(تجدید و احیائے دین ص۳۲)

مہدی کے نام پر افسانہ نویسی

ان تمام خیالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ مودودی صاحب مہدی کے نام پر ایک افسانہ بنا رہے ہیں جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس فرمان کی کھلی تضحیک ہوتی ہے آپ بالفاظ دیگر ڈرامائی انداز میں یہ کہہ رہے ہیں کہ مستقبل میں آنے والے مہدی کے سپرد کام تو بہت اہم کیا جائیگا کہ آپ موجودہ نظام باطل کو پاش پاش کرکے صحیح اسلامی حکومت قائم کریں اور زندگی کے ہر شعبہ میں اجتہادی کمالات کے وہ جوہر دکھلائیں کہ رئیس المجددین شاہ حضرت ولی اللہ شاہ صاحب کی بصیرت بھی ماند پڑ جائے۔

مگر اتنے بڑے کام کی سرانجام دہی کے لئے جس غیر معمولی طاقت، فعال مرکز، بے پناہ تنظیم اور لامحدود جذبۂ اطاعت کی ضرورت ہوگی اس پر خود اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول کی طرف سے "کرفیو" (Censorship) لگا دیا جائیگا۔ کیونکہ نہ تو اسے یہ حق دیا جائے گا کہ وہ اپنے مہدی ہونیکا اعلان کرے، نہ وہ لوگوں کو یہ فیصلہ کن دعوت دے سکیگا

کہ وہ اسلامی تقاضوں کو سمجھتے ہوئے میرے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور میری کمان میں اسلامی حکومت کے لئے جدّوجہد کریں۔ نہ مسلمانوں کو ان علامات کی خبر ہوگی جن سے وہ موعود شناخت ہو سکے اور نہ اس کے لئے سماوی و ارضی نشانات کا ظہور ہوگا کہ انہی سے اندازہ ہو سکے کہ وہ مہدی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر خود مہدی کو بھی اس بات کا علم نہیں دیا جائے کہ وہ اسلام کی ہمہ گیر تحریک کو قائم کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اور اس طرح خود مہدی اور تمام دنیا آخر وقت تک برپا ہونے والے انقلاب سے ناواقف رہیں گے۔ یہ تو امام مہدی کی زندگی تک کی حالت ہے لیکن جب آپ اس دنیا سے آنکھیں بند کر لیں گے تو تمام مسلمانوں کی آنکھیں یکدم کھُل جائیں گی اور وہ دیکھیں گے کہ دعوئی اور علامات کی بندشوں کے باوجود اور بغیر کسی مرکز اور قابل اطاعت امیر کے یہ دُنیا خود بخود بدل گئی ہے اور خدائی توحید اور زمام سیاست سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر مسلمان خود بخود سمجھ لیں گے کہ یہی وہ امام مہدی ہے جس کے مبارک دور کے متعلق حضرت رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خبر دی تھی کیف تھلک امّۃ انا اولھا وعیسیٰ[1] ابن مریم اٰخرھا (کنز العمال جلد ۷ صـ۲۰۳) اور ہمیں وصیت فرمائی تھی۔ فقال اذا رأیتموہ فبایعوہ ولو حبوا علی الثلج فانّہ خلیفۃ اللہ المھدی[2]۔ (دفع الحاجہ عن سنن ابن ماجہ صـ۳۲۲ مطبع صدیقی لاہور)

[1] یاد رہے کہ حدیث کی رو سے امام مہدی اور مسیح موعود دونوں ایک ہی وجود ہیں۔ ولا المھدی الا عیسیٰ ابن مریم (دفع الحاجہ عن سنن ابن ماجہ صـ۳۰۲)۔

[2] مسند احمد بن حنبل جزء ۲ صـ۲۱۱ مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر۔

یعنی اے مسلمانو! جب امام مہدی کا ظہور ہو تو گھروں میں نہ بیٹھے رہنا بلکہ اس کے استقبال کیلئے گھٹنوں کے بل برف کے تودوں پر بھی گذرنا پڑے تو گذر کر چلے جانا (دوسری حدیث میں ہے۔ اور میری طرف سے اُسے ہدیۂ سلام پیش کرنا۔) یہ ہیں وہ آئندہ کے حالات جو مودودی صاحب نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے طور پر "اندازہ"[3] کر کے مرتب کئے ہیں۔

مہدی کہلانے کی تیز خواہش

قارئین حیران ہونگے کہ اس قدر بے سروپا داستان کس لئے گھڑی جا رہی ہے مگر دراصل حیرانی کی کوئی بات نہیں بلکہ سیدھی سادھی بات ہے کہ مودودی صاحب کے اندر مہدی کہلانے کی ایک تیز خواہش پائی جاتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے نہ آپ وحی و الہام سے مشرف ہیں اور نہ آپ کے اندر وہ علامات ہی ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے مہدی کے لئے بیان فرمائی تھیں۔ اور نہ آپ میں اس قدر جرأت اور مردانگی ہے کہ آپ کھُلے لفظوں میں اس کا اظہار کر سکیں۔ اس نقص کو دیکھ کر آپنے پہلے تو وحی و الہام کو بھی مہدی کی ذات سے خارج قرار دیدیا۔ حدیث کی بیان کردہ علامات کا بھی سراسر انکار کر دیا۔ اور پھر دعوئی مہدویت کو حماقت قرار دیکر امام مہدی کی مندرجہ ذیل دو صفات پر زور دینا شروع کر دیا۔

اوّل یہ کہ آنے والا مہدی ایک نیا مذہب فکر ایجاد کریگا اور ہمہ گیر تحریک قائم کر دیگا۔

دوم "میرا اندازہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانے میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل مہم کو وہ خوب سمجھتا ہوگا" (تجدید و احیائے دین)

[3] تجدید و احیائے دین صـ۳۲۔

اب پہلی صفت کے مطابق آپ بڑے زور دار لفظوں سے اپنی تحریک کے متعلق پراپیگنڈا کر رہے ہیں :-

"حقیقی انقلاب اگر کسی تحریک سے ہو سکتا ہے تو وہ صرف ہماری یہ تحریک ہے اور اس کے لئے فطرتاً بھی ایک طریق کار ہے جو ہم نے خوب سوچ سمجھ کر اور اس کے دین اور اس کی تاریخ کا گہرا جائزہ لیکر اختیار کر رکھا ہے۔" (تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں صفحہ ۲۹)

دوسری صفت کو عملاً اپنے اوپر چسپاں کرنے کے لئے "حق قلم" کی قوت سے یہ اثر جما رہے ہیں کہ آپ ایک جدید ترین لیڈر ہیں اور تمام مسائل جدیدہ پر آپ کو دسترس حاصل ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آپ کی جماعت زبان سے تو آپ کو مہدی کہنے سے ہچکچاتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ آپ کو مہدی سے کم بھی نہیں سمجھتی اور اس کی طرف سے آئے دن آپ کی شانِ مہدویت کے متعلق کئی انداز میں اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں "جماعت اسلامی" کے تین بڑے عمائدین کی تحریرات بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

ملک نصر اللہ خان صاحب عزیز

"اس کے ایڈیٹر ملک کے ممتاز مفکر اور متکلم اہل قلم ہونے کی حیثیت سے ایک مخصوص اور غیر معمولی پوزیشن رکھتے ہیں - وہ قدیم و جدید علوم و معارف کے جامع البحرین ہیں۔" (کوثر ۲۵ر فروری ۱۹۴۷ء)

نعیم صدیقی صاحب :-

"وہ کسی شے کو حق ماننے کے بعد اس سے الگ نہیں ہو سکتا اور کسی شے کو باطل ماننے کے بعد اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔" (کوثر ۱۱ جنوری ۱۹۴۸ء)

میاں محمد طفیل صاحب :-

"مولانا اس زمانہ میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور سند ہیں۔" (قاصد کشمیر نمبر)

مودودی صاحب کے رفقاء اور ان کے ہم خیال دوستوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی مہدی کی آمد سے متعلق پیشگوئی اتنی معمولی نہیں کہ اسے چند کتابوں اور رسالوں کی اشاعت سے زیادہ کوئی اہمیت نہ ہو اور سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے چند گنتی کے افراد کو اپنے ساتھ ملا لینے پر ہی اسے چسپاں کر لیا جائے۔

حضرت امام مہدی کی بلند پایہ شخصیت امتِ مسلمہ میں ایسی ہی ممتاز ہے جیسے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس۔ مہدی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام کی وہ دوسری دیوار ہے جو آخری زمانہ میں اسلام پر آنے والے مصائب کے لئے سدِ سکندری کا کام دیگی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کیف تھلک امۃ انا اولھا وعیسی ابن مریم[1] اٰخرھا (کنز العمال جلد ۷ صفحہ ۲۰۳) اس شان کے انسان کی پیشگوئی مودودی صاحب پر کسی طرح چسپاں نہیں ہو سکتی اور نہ اس تمسخرانہ انداز سے اس عظیم الشان موعود انسان کا انکار کیا جا سکتا ہے جو اس پیشگوئی کے مطابق قادیان کی بستی میں ظاہر ہو چکا ہے۔

مقامِ مہدی حضرت امام مہدی کا اصل مقام کیا ہے اسے سائنٹفک (Scientific) طریق سے یوں سمجھیے کہ آنے والا موعود کوئی قانون ساز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بادشاہِ عالم کی طرف سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو ایک مکمل قانون دیا جا چکا ہے۔

---

[1] مسیح موعود اور امام مہدی ایک ہی وجود کے دو نام ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے ولا المھدی الا عیسی ابن مریم (رفع الحجاب عن سنن ابن ماجہ صفحہ ۳۰۰)

اب اس قانون میں نہ کسی اضافے کی گنجائش ہے نہ ترمیم کی۔ اس قانون کا تقاضا یہ ہے کہ ہر فرد بشر اس مکمل قانون پر پوری قوت سے عمل کرے۔ مگر یہاں عجیب صورت حال ہو رہی ہے کہ آج ——— تیرہ سو سال کے بعد ——— اگرچہ قانون ساز بادشاہ بھی موجود ہے اور اس کا مکمل قانون بھی صحیح و سالم ہے مگر اب اس پر عمل کیوں نہیں ہو رہا۔ البتہ ہزاروں اور لاکھوں وکلاء صدیوں سے اس کے متن پر ہی اُلجھ رہے ہیں اور یہی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس مکمل قانون کا اصل مفہوم کیا ہے۔

اب اس کشمکش کے ختم ہونے کی یہ تو صورت نہیں کہ ہائی کورٹ (High Court) کے دروازے مقفل کر دیئے جائیں اور چند وکلاء آپس میں مل کر کوئی فیصلہ کر کے یہ مشہور کر دیں کہ شاہی فرمان اور اس کے دستور کا یہ مقصد ہے۔ بلکہ اصل صورت یہ ہے کہ خدا تعالےٰ جو اس وسیع دنیا کا ازلی ابدی زندہ بادشاہ ہے اپنی عدالت کا حق ادا کرے اور اپنے قانون کی توضیح کے لئے اپنی طرف سے ایک جج (Judge) مقرر کرے جو وکلاء کی غلط فہمیوں کو دُور کرے اور ان کو ہر مسئلہ میں بادشاہ کے منشاء سے آگاہ کرے۔ یہی جج حدیث کی مقدس اصطلاح میں **الامام المھدی** کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ جس کے متعلق خود حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے **یوشك من عاش منكم ان یلقی عیسی ابن مریم اماماً مھدیاً حکماً عدلاً** (مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۴۱۱) فرمایا وہ آنے والا موعود جو عیسیٰ ابن مریم کی سی صفات کا حامل ہو کر دُنیا میں ظاہر ہوگا امام ہوگا یعنی اسے منصب امامت پر سرفراز کیا جائے گا اور اس کی اقتدار فرض ہوگی۔ وہ مہدی ہوگا یعنی اسے براہِ راست خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور راہنمائی بخشی جائے گی۔ وہ حَکَم ہوگا یعنی خدائی جج ہوگا جو ہر پہلو سے دُنیا کے تمام مسائل میں اپنے فیصلے صادر کریگا۔ پھر فرمایا وہ محض جج ہی نہ ہوگا بلکہ عَدَل بھی ہوگا یعنی اس کے فیصلے بموں اور ٹینکوں کے زور سے نہ منوائے جائیں گے بلکہ خود عدل و انصاف کی قوت لوگوں کو اس کے پیچھے ہو لینے پر مجبور کر دے گی۔

اِن الفاظ کو پڑھیئے اور دیکھیئے کہ یہاں کسی ایسے شخص کا ذکر نہیں ہو رہا جو اقتدار اور انقلاب پسندی کی ہوس میں تلواروں سے دُنیا کے نظام کو چیلنج کریگا۔ نہ کسی ایسے مادی انسان کا ذکر ہے جو اپنی ذاتی قوت سے نظامِ اسلامی کے قائم کرنے کا مدعی ہو۔ اور نہ ایسے شخص کا ذکر ہے جو مستغنی ہونے کا خیال کرے اور اپنے پروگرام اور طریقِ کار کو اپنے قیاس سے بناتا اور بدلتا رہے۔ بلکہ یہاں خدا کی طرف سے منصب امامت پر فائز ہونے والا مقدس وجود مراد ہے اور اسے امام، مہدی اور حَکَم قرار دیکر صاحب کشف، صاحب الہام اور صاحب وحی بتایا جا رہا ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص شریعت کے تمام مسائل میں عادل اور منصف جج اسی صورت میں بن سکتا ہے جب خدا کا الہام اس کی راہنمائی کرے کیونکہ انسانی فکر و اجتہاد خواہ کیسے ہی زبردست ہوں کسی طرح بھی اصل قانون نہیں کہلا سکتے۔ خود مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

> (۱) "انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کرے دونوں صورت میں اس کا اجتہاد دُنیا کیلئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ انسانی عقل و علم ہمیشہ زمانے کی قیود سے مقید ہیں۔" (تنقیحات صفحہ ۱۲)

(۲) "انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی اور محدودیت کا اثر لازماً پایا جاتا ہے جو خدا کی طرف سے ہوگا۔ اس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پا سکتے جو کبھی کسی زمانہ میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو۔"

(۳) "انسانی فکر کی دوسری بڑی کمزوری نقطۂ نظر کی تنگی ہے۔ اس کے برخلاف خدائی فکر میں وسیع ترین نقطۂ نظر پایا جاتا ہے۔"

(۴) "انسانی فکر کا تیسرا اہم خاصہ یہ ہے کہ اس میں حکمت و دانش جذبات و خواہش کے ساتھ کہیں نہ کہیں ساز باز اور مصالحت کرتی نظر آتی ہے۔ بخلاف اس کے خدائی فکر میں بے لاگ حکمت اور خالص دانشمندی کی شان نمایاں ہوتی ہے۔" (دین حق شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی پٹھانکوٹ ص۳)

مودودی صاحب اس سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صاحب وحی اور الہام تسلیم کرنے کے باوجود حضور کے ذاتی گمان اور فکر کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں :-

"آپ کا گمان وہ چیز نہیں جس کے صحیح نہ ہونے پر آپ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو۔ یا جس پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف کئے گئے ہوں۔ پھر جبکہ ان واقعات سے ان باتوں کی تردید بھی ہو چکی ہے جو اس سلسلہ میں آپ نے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ خواہ مخواہ ان کو عقائد میں داخل رکھنے پر اصرار کیا جائے۔" (ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۶ء صـ۱۵۱)

پس انسانی فکر یقیناً اس قابل نہیں کہ وہ حکماً عدلاً کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اس کے لئے لازماً خدائی الہام اور وحی کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنیوالے مہدی اور مسیح کے متعلق پہلے سے احادیث میں یہ خبر موجود ہے کہ خدا اس پر وحی و الہام کرے گا۔[1] اور اس کی روشنی میں وہ اپنی جماعت کا پروگرام تجویز کریگا۔

مگر موجودہ زمانے میں فقط صاحب الہام ہونا بھی کافی نہیں۔ کیونکہ (۱) موجودہ زمانہ ایک وسیع اور **عالمگیر تحریک کا تقاضا** کر رہا ہے جو دنیا کے سارے نظام کو بدل دے۔[2] (۲) سوال صرف نظام اسلام کے چلانے کا نہیں بلکہ از سرِ نو قائم کرنے کا ہے۔[3] (۳) تمام مجددین بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اجتہادات اب موجودہ زمانے کے کام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی نہیں۔[4]

پس ان وجوہات کی بنا پر جبکہ **وسیع اور عالمگیر تحریک کی ضرورت ہے از سرِ نو قیام کا سوال** ہے اور گذشتہ مجددین کے اجتہادات بالکل ناکافی ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی ایسی زبردست روحانی قوت رکھنے والے انسان کی ضرورت ہے جو اتنے بڑے کام کو سرانجام دے سکے۔ مگر اس قدر زبردست بصیرت اور قوت کا مالک کون ہو سکتا ہے۔ اسکا جواب مودودی صاحب کے الفاظ میں یہ ہے :-

"مجدد نہایت صاف دماغ ۔۔۔۔ زمانے کی بگڑی ہوئی رفتار سے لڑنے کی طاقت و جرأت، قیادت و رہنمائی کی پیدائشی صلاحیت، اجتہاد اور تعمیرِ نو کی غیر معمولی اہلیت ۔۔۔۔ مدت ہائے دراز کی الجھنوں

---

[1] اذا وحی اللہ الیٰ عیسیٰ ابن مریم (مشکوٰۃ مطبع قیومی کانپور۔ [2] تجدید و احیائے دین ص۳۲ ۔
[3] شہادت حق ص۳ [4] تجدید و احیائے دین ص۹۶ ۔

میں سے امرِ حق کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر الگ کر لینا۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن کے بغیر کوئی شخص مجدد نہیں ہو سکتا۔ اور جو اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر نبی میں ہوتی ہیں۔"

(تجدید و احیائے دین ص ۲۸ و ص ۳۱)

مودودی صاحب کے اس بیان سے صاف کھل گیا کہ نظامِ حق کے قیام کی بے پناہ طاقت رکھنے والا وجود مجددین سے بڑھ کر نبی کا وجود ہے۔ پس صاف نتیجہ نکلا کہ آنے والے امام مہدی کا مقام محض مجددیت کا مقام نہیں بلکہ نبوت کا مقام ہے۔ اور یہ نتیجہ بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے مسیح کو ایک دو یا تین دفعہ نہیں چار دفعہ نبی اللہ کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔[1]

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ابتداء میں جب مودودی صاحب نے اپنی جماعت تیار کرنی شروع کی تو انکے رفقاء کو بھی یہی احساس تھا:-

"اکثر لوگ اقامتِ دین کی تحریک کیلئے کسی ایسے مردِ کامل کو ڈھونڈتے ہیں جو اُن میں سے ایک ایک شخص کے تصورِ کمال کا مجسمہ ہو اور جس کے سارے پہلو قوی ہی قوی ہوں ...... دوسرے الفاظ میں یہ لوگ دراصل نبی کے طالب ہیں اگرچہ زبان سے ختمِ نبوت کا اقرار کرتے ہیں۔ اور کوئی اجرائے نبوت کا نام بھی لے دے تو اس کی زبان گُدی سے کھینچنے کے لئے تیار ہو جائیں مگر اندر سے ان کے دل ایک نبی مانگتے ہیں۔ اور نبی سے کم کسی پر راضی نہیں۔" (ترجمان القرآن [illegible])

یہی نہیں خود مودودی صاحب کو ۱۹۳۴ء میں علماء کی حالت کا نقشہ دیکھتے ہوئے یہ اعتراف کرنا پڑا تھا:-

"افسوس کہ علماء الا ماشاء اللہ خود اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہو چکے تھے۔ ان میں تفقہ نہ تھا۔ ان میں حکمت نہ تھی۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ خدا کی کتاب اور رسولِ خدا کی علمی اور عملی ہدایت اسلام کے دائمی اور لچکدار اصول اخذ کرتے اور زمانہ کے متغیر حالات میں ان سے کام لیتے۔"

اس بے بسی کی وجہ یہ تھی:-

"یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ایسے وقت میں مسلمانوں کی کامیاب راہنمائی کر سکتے جبکہ زمانہ بالکل بدل چکا تھا اور علم و عمل کی دنیا میں ایسا عظیم تغیر واقع ہو چکا تھا کہ جس کو خدا کی نظر تو دیکھ سکتی تھی مگر کسی غیر نبی انسان کی نظر میں یہ طاقت نہ تھی کہ قرنوں اور صدیوں کے پردے اٹھا کر اُن تک پہنچ سکتی۔"

(تنقیحات ص ۲۷ مکتبہ جماعت اسلامی)

پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور موجودہ زمانہ کے تقاضا کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ یقین کرنا ہوگا کہ امام مہدی کا منصبِ نبوت پر فائز ہونا ضروری ہے۔ یہ ہے وہ صحیح مقام جس کی روشنی میں ہمیں الامام المہدی کی تلاش کرنی چاہیئے۔ اور یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ تحریکِ اقامتِ دین کے وہ تمام مدعی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے کام میں سر دھڑ بکار ہیں۔ جو نورِ الہام، نورِ نبوت اور نورِ وحی سے نہ صرف محروم ہیں بلکہ اس کے منکر بھی ہیں۔ اور اصل انقلاب صرف منصبِ نبوت پر فائز ہونیوالے انسان کے ہاتھ سے ہی ہو سکتا ہے۔

مہدی کی تلاش میں قرآنی رہنمائی | اس حقیقت کو

[1] مشکوٰۃ ص ۴۸۴ مطبع قیومی کانپور۔ کتاب الفتن

سمجھ لینے کے بعد آئیے الامام المہدی کی تلاش کریں۔ مگر اس کی تلاش سے پہلے کیوں نہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہی حاضر ہوں۔ تاکہ اس عالی بارگاہ سے ہم اپنی منزل کے سنگ راہ معلوم کر لیں اور ہمیں بڑی آسانی سے وہ موعود مل جائے جو تحریک اسلام کا آخری زمانہ میں علمبردار ہے۔

یقین کیجئے جب ہم اس خیال سے ذرا آگے بڑھتے ہیں تو قدم قدم پہ یہ بدگمانیاں اور غلط فہمیاں دور ہوتی جاتی ہیں کہ خدا تعالےٰ اور اس کے رسولؐ نے مہدی کی شناخت کے لئے ہمیں بالکل اندھیرے میں چھوڑ دیا ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس قرآن تو اصولی طور پر ہمیں یہ کہہ رہا ہے کہ انّا علینا للھدیٰ کہ ہم ہر مشکل کے وقت رہبری کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ پھر اس نے اسی پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک مدعیٔ الہام و نبوت کی صداقت کے پہلے سے معیار قائم کر رکھے ہیں تاکہ آئندہ زمانہ میں مدعیٔ صادق اور مدعیٔ کاذب کا فرق نمایاں ہوتا رہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمّت باطل کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہے اور خدا پرست انسان الٰہی قائدین سے بے بہرہ کر نعمت الٰہی سے محروم رہ جائیں۔

مثلاً قرآن کریم **ایک معیار** یہ بتاتا ہے کہ مدعیٔ الہام کی چالیس سالہ زندگی پہ نگاہ ڈالو تو اگر تمہیں اس میں تقدس اور پاکیزگی کے سوا کچھ بھی نظر نہ آئے[1] تو سمجھ لو کہ یہ ارضی انسان نہیں بلکہ آسمانی پیامبر ہے۔

دوسرا معیار یہ بتاتا ہے کہ وہ مدعیٔ کاذب نہیں جو لوتقوّل کی وعید سے محفوظ ہو کر قتل سے بچ جائے اور اس کا سلسلہ تباہ و برباد ہونے کی بجائے ایک عالمگیر شہرت حاصل کرے[2]

تیسرا معیار یہ بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ ان کے ذریعہ مختلف اخبار غیبیہ کا بکثرت ظہور فرماتا ہے جو اپنے وقت پر پوری ہوتی ہیں[3]

چوتھا معیار یہ بتاتا ہے کہ نبی کی پیش کردہ تعلیم اور مجتہدانہ بصیرت میں ایک خاص مقناطیسی کشش ہوتی ہے جس سے ایک عالم کا عالم کھنچا ہوا اس کے پاس آجاتا ہے۔ اور جو لوگ اس کی غلامی سے باہر بھی کھڑے رہتے ہیں وہ بھی اسے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اور بزبانِ حال پکار اُٹھتے ہیں لوکانوا مسلمین[4]

رسُولِ مقبول اور صلحائے اُمت کے اشارے

یہ تو وہ فیصلہ کن معیار ہیں جو قرآن مجید ہمیں امام مہدی بلکہ ہر مدعیٔ الہام و نبوت کی شناخت کے لئے بتاتا ہے۔ اب اگر حدیث اور علمائے اُمت سے الامام المہدی کی علامات ملاحظہ کریں تو ہمیں اس آنے والے موعود کی تلاش میں کوئی دقت نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ

(۱) اس مہدی کا زمانہ تیرھویں صدی کا آخر اور چودھویں صدی کا آغاز ہے[5]

(۲) ان لمھدینا آیتین[6] لم تکونا منذ خلق السّمٰوٰت والارض ینکسف القمر لاوّل لیلۃ من رمضان و

---

[1] لقد لبثت فیکم عمراً من قبلہٖ افلا تعقلون۔ (سورۃ یونس)

[2] لوتقوّل علینا بعض الاقاویل۔ الخ (الحاقۃ) [3] وما کان اللہ لیطلعکم۔ الخ (آل عمران) [4] پارہ ۱۴ رکوع ۱۔

[5] حج الکرامہ نواب صدیق الحسن صاحب صفحہ ... حضرت مولانا اسمٰعیل شہید کی کتاب اربعین فی احوال المہدیین پہلا ایڈیشن ۱۲۶۸ھ میں یہ شعر ملاحظہ ہو۔

در سال غین گذشت او سال
بوالعجب کار و بار می بینم

[6] دارقطنی مطبع فاروقی دہلی صفحہ ۱۸۸

تنخسف الشمس فی النصف منہ۔

یعنی جب سے زمین و آسمان پیدا ہوئے یہ دو نشان کسی اور کے وقت ظاہر نہیں ہوئے۔ بلکہ امام مہدی کے لئے ظاہر ہوں گے۔ ان میں ایک یہ کہ رمضان کے مہینہ میں تیرھویں تاریخ میں جو اس کی مقررہ تاریخوں میں سے پہلی ہے گرہن لگیگا اور دوسرا یہ کہ سورج کا گرہن اپنی درمیانی تاریخ یعنی اٹھائیس کو دکھائی دیگا۔ اور یہ دونوں نشان رمضان کے مہینہ میں ظاہر ہوں گے۔

(۳) وہ مشرق سے ظاہر ہوگا اور سرزمین کدعہ سے طلوع کریگا[۱]۔

(۴) اس کا رنگ گندم گوں ہوگا۔ پیشانی فراخ اور چمکدار ہوگی[۲]۔ ناک بلند ہوگا اور بال سیدھے اور لمبے ہوں گے۔

(۵) اس کے زمانہ میں حقیقت محمدی حقیقت احمدی سے موسوم ہوگی[۳]۔

(۶) وہ کاسر صلیب ہوگا جس کے الہامی معنے یہ ہیں کہ مذہب[۴] عیسائیت کی دھجیاں اڑا دیگا۔

(۷) امام مہدی کا ایک فرزند[۵] جس کا نام محمد ہوگا اس کی وفات کے بعد کھڑا ہوگا اور اس کے مشن کی تکمیل کریگا۔

یہ ہیں چند موٹی موٹی علامات جو حدیث اور صلحاء امت کے اقوال سے ہمیں ملتی ہیں۔

مہدی امت کا ظہور

قرآن مجید، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صلحاء امت سے راہنمائی حاصل کرنے کے بعد جب دنیا کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک نگاہ ڈالتے ہیں اور آج سے نصف صدی پیچھے ہٹتے ہیں تو ہماری مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان تمام علامات اور معیاروں کے بالکل مطابق چودھویں صدی کے آغاز میں منصب مہدویت کے سرتاج کی طرف سے یہ دلربا آواز آرہی ہے ؎

رسید مژدہ ز غیبم کہ من ہماں مردم
کہ او مجدد ایں دین و رہنما باشد

ہم آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو آسمان پر اس کی خاطر رمضان میں کسوف و خسوف کا نشان ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ وہ ہندوستان یعنی مشرق کا رہنے والا ہے قادیان یعنی کدعہ کی بستی اس کا مہبط ہے اور وہ ایک عالم کو اپنے حلیہ کے متعلق پُر زور الفاظ سے یہ اعلان کرتا ہے ؎

موعودم و بحلیۂ ماثور آمدم
حیف است گر بدیدہ نہ بینند منظرم

پھر اس کی تحریک احمدیت کے نام سے دنیا پر چھارہی ہے اور احمدی کہلانے والے اس کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ اس کے کاسر الصلیب ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ اپنوں کے علاوہ بیگانوں کی زبان پر بھی جاری ہے:۔

"اس مدافعت نے نہ صرف عیسائیت کے اس ابتدائی اثر کے پرخچے اڑا دئے جو سلطنت کے سایہ میں ہونے کی وجہ سے حقیقت میں اس کی جان تھا اور ہزاروں لاکھوں مسلمان اس کے

۱؎ جواہر الاسرار از شیخ حمزہ بن علی ص۵۶۔ ۲؎ بخاری کتاب الفتن باب ذکر الدجال و ابوداؤد جلد ۲ ص۲۲۲ المطبع التازیہ بمصر۔ الصراط السوی ص۵۲۸۔ اقتراب الساعۃ ص۱۱۵۔ حجج الکرامہ ص۳۶۴۔
۳؎ مبدا و معاد از مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مطبع مجددی امرتسر ص۵۵
۴؎ عمدۃ القاری فی شرح بخاری جلد ۵ ص۵۸۴ مطبوعہ مصر علامہ طیبی اور عینی شرح بخاری جلد ۵ ص۴۸۵۔ ۵؎ (پیشگوئی حضرت امام یحییٰ بن عقب در اربعین فی احوال المہدیین)

زیادہ خطرناک اور سخت کامیاب حملہ کی زد سے
بچ گئے بلکہ خود عیسائیت کا طلسم دھواں
ہو کر اُڑنے لگا۔" (اخبار وکیل امرتسر ۳۰ مئی ۱۹۰۸ء)

پھر ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ امام مہدی کا موعود فرزند محمود گذشتہ نوشتوں کے مطابق دُنیا کے پردہ پر رونق افروز ہو چکا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ہمارا دل رقت سے بھر جاتا ہے اور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی اور اولیائے اُمت کی روحانی قوت کا ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ انہوں نے جو کچھ فرمایا تھا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے پورا ہو گیا ہے۔ اور یہ معلوم کر کے کہ وہ آنے والا موعود کسی نئی شریعت، کسی نئے قانون اور کسی نئی نبوت کا دعوے نہیں کرتا بلکہ اسے دربارِ رسالت کی غلامی اور دربانی پر ایک ناز ہے اور وہ رُوح پرور انداز سے دُنیا میں منادی کرتا ہے ؎

این چشمۂ رواں کہ بخلقِ خدا دہم
یک قطرۂ زبحرِ کمالِ محمدؐ است

ہماری روح سجدہ میں گر جاتی ہے اور زبان پر بیساختہ جاری ہو جاتا ہے۔ ربنا اننا سمعنا منادیاً ینادی للایمان ان اٰمنوا بربکم فاٰمنا۔

قرآن کے معیارِ صداقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اولیاءِ کرام کی بیان فرمودہ علامات کے بعد جب ہم خود قرآن کے ذریعے اسے جانچتے ہیں تو اس کی صداقت سورج کی طرح روشن ہو جاتی ہے۔

اس کے دعویٰ مہدویت سے قبل زندگی پر اس کے چیلنج کے باوجود کسی دشمن کو بھی اعتراض کرنے کی جرأت نہیں ہو سکی بلکہ اس کے مخالفین بھی اس کی مقدس اور مطہر زندگی کا اقرار کرتے رہے ہیں[1]۔

اس کے وجود میں خدائی حفاظت کے یہ سامان نظر آتے ہیں کہ ہندو، عیسائی اور مسلمان غرضیکہ سب قومیں اسے قتل کر دینے کے درپے ہیں مگر وہ اللہ کا بندہ تنہا ہونے کے باوجود شیر کی طرح کھڑا آواز دے رہا ہے ؎

اے آنکہ سوئے من بدویدی بصد تبر
از باغباں بترس کہ من شاخِ مثمرم

اس کی جماعت مخالفت کے بے پناہ طوفانوں کے باوجود بڑھتی چلی جا رہی ہے اور اسلام کے نام لیوا یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں کہ وہ بیج جو قادیان میں بویا گیا تھا اب ایک تناور درخت بنتا چلا جا رہا ہے۔ جس کی شاخیں ایک طرف چین تک پہنچی ہوئی ہیں اور دوسری طرف یورپ کے ساحلوں تک پھیل رہی ہیں۔

یہ موعود اپنے ساتھ صدہا نشانات اور معجزات بھی لایا ہے۔ ناقدوں کی صدہا ناک حالت، ایوان کسریٰ میں تزلزل، مشرقی طاقت اور کوریا کی نازک حالت، خلافت کا سقوط، طاعون، ہجرت، مصلح موعود، مسلمانوں کی از سرِ نو ترقی، بے شمار پیشگوئیاں، اس نے قبل از وقت سنائیں جو بعد میں پوری شان سے وقوع پذیر ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔

اس کی تعلیم میں ایک خاص کشش ہے۔ علماء سہمے ہوئے پھر رہے ہیں کہ اگر عوام اس کی کتب اور تحریرات کا مطالعہ کریں گے تو اس کی صداقت آشکار ہو جائے گی اور ان کا جادو ٹوٹ جائیگا۔ ان میں سے ایک طبقہ اسکے پیدا کردہ مجاہدانہ نظام کی وسیع پیمانے پر نقالی بھی کر رہا ہے اور لوکانوا مسلمین کی حسرت میں کھویا جا رہا ہے۔

یہ ہے وہ حقیقی مہدی جس کی صداقت پر قرآن بھی گواہ ہے، حدیث اور اُمت کے اقوال بھی اس کی تصدیق کر رہے ہیں اور یہی وہ اسلام کا فتح نصیب جرنیل ہے

[1] علیگڑھ انسٹیٹیوٹ جون ۱۹۰۸ء، تہذیب النسواں، وکیل، ہمدمی ۱۹۰۸ء، اخبار زمیندار مئی ۱۹۰۸ء، اشاعۃ السنہ جلد ۷ نمبر ۹ وغیرہ

[2] زمیندار ۱۹ اکتوبر ۱۹۲۴ء

جس کی قیادت میں دُنیا کے ہر بر اعظم میں اسلام کے مشن روحانی انقلاب برپا کرنے کی سرگرم کوشش کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پُر حکمت تعلیم کی اشاعت کی جا رہی ہے اور جگہ جگہ اسلامی مدارس اور مساجد کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔

اور جس کے پیدا کردہ عُلم کلام میں یہ برکت ہے کہ اسکا مطالعہ کرتے ہی کفر کی افواج کے نیک دل سپاہی اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے ہیں اور کفر کے خلاف لشکر لئے بغیر انہیں کل نہیں پڑتی۔

نقشہ عالم پر رُوحانی جنگ

ہاں یہ اسی مہدی کا کرشمہ ہے کہ اسکے اشارے پر سینکڑوں مردانِ مجاہد ملکوں، قوموں اور خاندانوں کو خیر باد کہہ کر اعلائے کلمۃ اللہ کی کوشش میں پوری سرفروشی سے مصروف ہیں۔

مصائب و آلام کے ہجوم ان کا احاطہ کیئے ہوئے ہیں۔ انہیں قتل کر دینے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ ملک اور قومیں ان کی مخالفت میں ایک ایک کر کے متحد ہو رہی ہیں۔ مگر یہ دیوانے بھی کچھ ایسے سخت جان ہیں کہ ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے بھی اسلام کا جھنڈا اپنے ہاتھ سے تھامے کھڑے ہیں اور اس یقین کے ساتھ کھڑے ہیں کہ وہ ایک دن دُنیا سے منوا کر چھوڑیں گے کہ روس کا اشتراکی نظام اور برطانیہ کا امپیریلیزم دنیا میں زندہ رہنے کے قابل نہیں۔ اب صرف اور صرف وہی دستورِ حیات نافذ کیا جا سکتا ہے جو قرآن کے خطوط اور اسکی لائنوں پر قائم کیا جائے گا۔

وہ ڈنکے کی چوٹ کہہ رہے ہیں کہ اب دُنیا کے ڈکٹیٹروں، شہنشاہوں اور پریذیڈنٹوں کو اپنے عہدوں سے دست بردار ہونا پڑیگا۔ انہیں اپنی کوتاہیوں پر معافی مانگنی ہوگی۔ غلطیوں کا اعتراف کرنا ہوگا اور خود اپنے ہی ہاتھ سے گورنر جنرل کا عہدہ حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرنا پڑیگا اور پھر عہدوں کی چھوٹی بڑی سب تقسیمیں حضور کے ادنیٰ اشارے سے منسوخ کر دی جائیں گی اور عہدے وہی تقسیم کیا جائیگا جنے پیغمبرِ عالم خود اپنے ہاتھ سے تقسیم فرمائیں گے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

دنیا میں ایک طرف کفر و اسلام کی فوجوں کا یہ معرکہ جاری ہے مگر دوسری طرف پاکستان کے کونے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اتنے بڑے محاذ جنگ کو دیکھتے ہوئے بھی تماشائی کی حیثیت سے بیٹھے ہیں اور "صالح قیادت" کے دلفریب نعروں سے لوگوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ اسلام کی تازگی اور اس کے نظام کے از سرِ نو قیام کا محکمہ اب خدا نے سال ۱۹۴۱ء سے ہمارے سپرد کر دیا ہے۔ اب خدا تعالیٰ کو اپنے پیغام کا کوئی فکر نہیں بلکہ یہ سارا بوجھ ہمارے نحیف و نزار کندھوں پر ڈال دیا گیا ہے کہ ہم اپنی کوشش سے اقصائے عالم میں اسلام کو سربلند کریں۔

حالانکہ انہیں صرف یہ نظر آ رہا ہے کہ دُنیا کی خوفناک حالت کے نقشہ کو بدل دینا کسی مادی رہنما اور سیاسی جماعت سے ممکن نہیں۔ ان کی سراسیمگی کا یہ عالم ہے کہ انہیں ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آ سکا کہ وہ دُنیا کو چھوڑ کر صرف پاکستان کی کیسے اصلاح کر سکتے ہیں۔ وہ جب عوام کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھتے ہیں تو یہ پروگرام بناتے ہیں کہ عوام تب مسلمان بن سکتے ہیں جب پارلیمنٹ کو پہلے مسلمان بنایا جائے۔ اور جب پارلیمنٹ کی طرف دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ پارلیمنٹ کے مسلمان کرنے کا طریق صرف یہ ہے کہ عوام پہلے مسلمان بنیں۔

پھر یہ وہ ہیں جنہیں صالح اور غیر صالح میں چیکنگ (Checking) کرنے کی تو مہارت ہے مگر کسی بندہ میں صالحیت پیدا کرنے کی توفیق نہیں۔

غرضیکہ اس قسم کے گورکھ دھندوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ اور بے بس ہو کر ایک نئے فاروق[1] کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔

مگر ان تمام حقائق کے باوجود ان بے چاروں کی خوش فہمی دیکھنے کے لائق ہے کہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ نظامِ باطل کو اُلٹ کر اس کی جگہ نظامِ حق قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن خدا جانے انہیں یہ کیوں خیال نہیں آتا کہ وہ امامِ عصر کے نقشے کو سامنے رکھ کر ایک مجسمہ (Statue) تو تیار کر سکتے ہیں مگر اس میں زندگی کی رُوح نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ اس دُنیا کی پوری تاریخ اور تجربہ یہی بتلاتے ہیں کہ یہ کام صرف خدا کے قائم کردہ مامورین کے ذریعہ ہی سرانجام پا سکتا ہے۔ پس جس طرح یہ ممکن نہیں کہ برنارڈ شا، شکسپیر یا میکسم گورکی قرآن کے ایک ایڈیشن پر اپنا نام لکھ کر کوئی انقلاب برپا کر لیں اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ کہ امامِ وقت کا کوئی نقال خواہ وہ اپنے فن میں کیسا ہی ماہر ہو اسلامی حکومت قائم کر دینے میں کامیاب ہو سکے۔

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی

---

[1] آنکھ پھر منتظرِ صبحِ قیادت ہے ابھی
ایک فاروق کی دنیا کو ضرورت ہے ابھی
(کوثر ۲۰ ستمبر ۱۹۴۹ء)

پھر ترے بندے ترے نام سے کرتے ہیں گریز
پھر سے پیدا کوئی فاروق سا انساں کر دے
(کوثر ۲۸ ستمبر ۱۹۵۱ء)

اشتہارات

رسید مژدہ کہ ایّام نو بہار آمد

(حضرت میر محمد اسحاق صاحبؓ کے قلم سے)

حضرت حکیم الامت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ جس طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بعد جماعت میں سب سے بڑے روحانی طبیب تھے اسی طرح ساری عمر آپ کی جسمانی بیماریوں کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر میں گذری۔ طبی دنیا میں جو شہرت آپ کو حاصل تھی وہ کسی سے مخفی نہیں۔ پنجاب سے لیکر پورے ملک تک سب پر آپ کا فیض جاری تھا۔ ایک طرف اگر

جموں و کشمیر کا عظیم الشان مہاراجہ

سالہا سال تک آپ کے زیر علاج رہا تو دوسری طرف آپ کے لئے یہ امر باعث فخر تھا کہ

عالم روحانیت کا عظیم الشان بادشاہ

یعنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بھی جب آپ قادیان میں ہجرت کر کے آئے وصال تک معالج رہے۔ حضرت حکیم الامت یونانی، میڈیکل، ہومیوپیتھک تینوں طریقوں سے علاج کرتے تھے۔ آپ نے اپنی ساری عمر کے تیر بہدف تجربات اپنے قلم سے ایک بیاض میں قلمبند کئے جس میں ہر مرض کے لئے نظیر سے بے نظیر نسخے درج ہیں۔ یہ بیاض آپ کے صاحبزادوں کے پاس ہے۔ حضرت مولوی صاحب کی وفات ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔ اسی وقت سے آج تک گو آپ کے بعض شاگردوں نے بعض

بعض نسخے بنا کر پبلک کو دیئے مگر یہ گنجینہ پوری طرح دنیا پر بند رہا۔ آپ کی وفات کے ۲۹ سال بعد خدا تعالیٰ نے آپ کے صاحبزادوں کو یہ توفیق عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنے حاذق الملک باپ کے مخفی تجربات کو اپنی نگرانی میں دیانت، امانت، سچائی اور تقویٰ سے خالص اور صحیح اجزا سے تیار کر کے دنیا کے فائدہ کیلئے پبلک میں لائیں۔ اور ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق بنیں۔ ان کی طرف سے اخبار الفضل کی ایک قریب کی اشاعت میں اس امر کا اعلان ہو چکا ہے۔ میں علیٰ وجہ البصیرت اس امر کے اعلان کی جرأت کرتا ہوں کہ حضرت

خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کے صاحبزادگان پوری توجہ، اخلاص اور ہمدردی کے ساتھ

بے نظیر باپ کے بے نظیر نسخوں کو

اپنی نگرانی میں بنوا رہے ہیں۔ اسلئے تمام دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ اعلان کردہ ادویہ یا جو بھی نسخہ بنوانا چاہیں وہ آرڈر دیکر بنوا سکتے ہیں۔

بالآخر دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم الامت کے فیض کو تا ابد جاری فرمائے۔ آمین ثم آمین ؛

ضروری اطلاع

دواخانہ نورالدینؓ جودھامل بلڈنگ لاہور میں مستورات کے علاج کا خاص انتظام ہے بیگم صاحبہ حکیم عبدالوہاب عمر دقابلہ گولڈ میڈلسٹ بیمار کو دیکھتی ہیں اور علاج کرتی ہیں۔

باہر کے اصحاب خط میں بیماری کی تفاصیل لکھ کر دوائی منگوا سکتے ہیں!

پتہ:۔ دواخانہ نورالدینؓ جودھامل بلڈنگ۔ لاہور

نظامِ اسلامی کا قیام ——— اور جماعتِ اسلامی

مکرم بشیر احمد صاحب رفیق بی۔ اے جامعۃ المبشرین

جماعت اسلامی کا دعویٰ ہے کہ وہ "تجدید و احیائے دین" کا مقدس مقصد لے کر اُٹھی ہے۔ اور یہ کہ اس کا کام وہی ہے جو انبیائے کرام اور مجددین کا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ "روداد جماعت اسلامی" کے صفحہ ۸ پر لکھا ہے:-

"دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ہم وہی مقصد اور دعوت لیکر اُٹھے ہیں جو آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کرام لیکر دنیا میں تشریف لاتے رہے ہے۔"

پھر اپنے طریقِ کار کے متعلق جماعتِ اسلامی کا دعویٰ ہے کہ ہم وہی طریق استعمال کریں گے جو انبیائے کرام اور مجددین استعمال کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اسی کتاب میں آگے چلکر لکھا ہے:-

"اس دعوت کو عملاً لیکر اُٹھنے، اسے اپنے دوسرے بھائیوں تک پہنچانے اور اس سے متاثر حضرات کو سمیٹنے اور جذب کرنے کا صحیح اور بہترین طریقہ وہی ہو سکتا ہے جو ابتدا سے آخر تک اس دعوت کے اصل علمبردار یعنی انبیائے کرام علیہم السلام کی رہنمائی میں اختیار کرتے رہے ہیں۔"

یہ تو ہے جماعت اسلامی کا دعویٰ۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو جماعت اسلامی نے اقتدار و حکومت کے اقتدار کی خاطر "تجدید دین" کا یہ سب ڈھونگ رچایا ہے۔ اسلام کی خدمت ان کے پیشِ نظر نہیں بلکہ مقصد صرف اور صرف اقتدار پر قابض ہونا ہے۔ اور چونکہ ان کو اس بات کا علم ہے کہ مسلمان طبعاً ہر اس تحریک کے ساتھ چلنے کو تیار ہے اور ہر اس تحریک کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی پیش کر سکتا ہے جو اسلام کے نام پر چلائی جائے، اسلئے جماعت کے اکابرین نے مذہب کا لبادہ اوڑھا تاکہ سیاسی مقصد براری میں آسانی رہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ نظامِ اسلامی کس طرح قائم ہو سکتا ہے اور اس کے قیام کا طریق کیا ہونا چاہیئے؟ اس کا جواب خود جماعت کے اکابرین نے دیا ہے کہ اصل طریق وہی ہے جو انبیائے کرام کا تھا۔ آئیے اب یہ دیکھیں کہ انبیائے کرام، مصلحین اور مجددین اُمتِ محمدیہ کا اس سلسلہ میں کیا طریق رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ سے ایک خاص پیغام لیکر مبعوث ہوتے ہیں اور ان کی اصل غرض بعثت یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان اور خدا تعالیٰ کے درمیان تعلق پیدا کریں اور اس تعلق کی استواری کے لئے خود واسطہ کا کام دیں۔ چنانچہ انبیائے کرام نے اس کے لئے جو طریقِ کار تجویز فرمایا اور جو راستہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو بتایا گیا وہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کے دلوں تک پہنچیں اور اُن کے ذہنوں میں انقلاب برپا کریں۔ ظاہر ہے کہ جب عوام ذہنی اور اخلاقی طور پر تیار ہو جائیں تو پھر ان کو نظام کی لڑی میں پرونا کوئی مشکل کام نہیں رہتا۔ پس ایک نظام کے قیام کے لئے سُنّتِ انبیاء کے ماتحت یہ ضروری ہے کہ عوام کے اذہان کو اپنی طرف پھیرا جائے۔ ان کے قلوب کو مسلمان بنایا جائے۔ اسی واسطے قرآن کریم نے "لا اکراہ فی الدین" کی تعلیم دیکر جبر، ظلم و تعدی اور زور بازو سے مذہب قبول کروانے کو منع فرمایا۔ اسکی فلاسفی یہی ہے کہ دبدبہ و حکومت اور جبر و اکراہ کے ذریعہ لوگوں کو تبدیلیٔ

مذہب پر جبر کرنے سے تعلق باللہ کا اصل مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے تمام انبیاء علیہم السلام نے لا اکراہ فی الدین کے بنیادی اصل کو اختیار فرمایا اور دوسروں کو بھی اسی پر عمل پیرا رہنے کی تلقین کی۔ آخر کتنے انبیاء ایسے ہیں جنہوں نے آغاز کار ہی حکومت کی گدی پر قابض ہو کر اصلاح خلق کا کام کیا ہو؟ یقیناً ایک بھی نہیں۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح خلق اور تجدید دین کے لئے آغاز کار کے طور پر حکومت پر قبضہ کرنا نہ صرف یہ کہ غیر ضروری ہے بلکہ غیر مستحسن بھی ہے۔ اسی اصل کی تعلیم حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ کہہ کر دی کہ "قیصر کا حق قیصر کو دو اور خدا کا حق خدا کو دو"

انبیاء علیہم السلام کے بعد یہی حال مجددین اُمت کا رہا ہے۔ ان کا مشن بھی اصلاح خلق تھا۔ مگر ان کا طریق (way of approach) دلوں کو مسخر کرنا تھا نہ کہ حکومت پر قابض ہونا۔ مذہب یقیناً ایک رحمت ہے اور جو لائحہ عمل مذہب تجویز کرے وہ یقیناً باعث فلاح ہے۔ پس یہ کس طرح ممکن ہے کہ رحمت اور برکت کو بزور ٹھونسا جائے۔ مثلاً کوئی بھی شخص ایک خوبصورت اور خوشبودار پھول کے متعلق کسی سے یہ منوانے کی کوشش نہ کریگا کہ ہو کہ یہ خوبصورت اور خوشبودار ہے بلکہ اس پھول کا ظاہری حُسن اور اس کی خوشبو خود دیکھنے اور سونگھنے والے سے اپنے خوبصورت اور خوشبودار ہونے کا اقرار کرائے گی۔ دین اسلام بھی ایک خوبصورت اور دلکش مذہب ہے۔ اس کے منوانے کے لئے دلوں کو فتح کرنے کی ضرورت ہے اور ڈنڈے سے دل کبھی فتح نہیں ہو سکتے۔ ڈنڈے سے جسم تو فتح ہو جائیں گے لیکن دل کبھی مسخر نہیں ہوں گے۔ اسی لئے مجددین اور مصلحین کی approach دلوں تک رہی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سینکڑوں مجددین اس سلسلہ میں مبعوث ہوئے کتنے ان میں سے ایسے ہیں جنہوں نے باقاعدہ حکومت حاصل کر کے اصلاح خلق کا کام کیا ہو؟ کوئی نہیں بلکہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے تو حکومت کو ٹھکرا دیا تھا کیونکہ اہل اللہ نے ہمیشہ حکومت سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔

پس اصلاح خلق اور تجدید دین کے لئے دلائل اور براہین کی تلوار کی ضرورت ہے۔ اس رستہ میں جبر و ظلم کا کوئی دخل نہیں، تجدید کے لئے ملکوں کو فتح کرنا نہیں بلکہ قلوب کو فتح کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں ؎

کام ہے میرا دلوں کو فتح کرنا نے دیار

جماعت اسلامی بھی اپنے قیام کے آغاز میں ہمارے بیان کردہ اس نظریہ سے متفق تھی اور ان کے قائدین کا یہی خیال تھا کہ تجدید دین ذہنی اور دلی قبولیت کے ذریعہ ہوگی چنانچہ مولانا اصلاحی صاحب فرماتے ہیں :-

"اگر آپ فی الواقع نظام اسلامی کے قیام کے خواہاں ہیں تو پہلے اپنے آپ کو اور اپنے لوگوں کے دلوں کو بدلئے۔ وہ دل ان جسموں کو بدلیں گے جن میں وہ دھڑک رہے ہوں گے۔ پھر وہ اجسام اپنے گھروں، خاندانوں، بستیوں اور شہروں کو بدلیں گے جن میں وہ رہتے ہوں گے۔ ان کی صورتیں اور ان کی سیرتیں ان کے معاملات، تعلقات، سیاست، تجارت، معاشرت، تمدن ہر شے بدلتی جائے گی تا آنکہ ایک ایسی سوسائٹی اور جماعت بن جائیں گے کہ ان کے سوا کسی دوسرے نظریۂ زندگی کا عملاً چلنا ناممکن اور محال ہو جائے گا۔ اور وہ نظام اسلامی وجود میں آئیگا جس کی ہر چیز اور ہر جز سراپا اسلام ہوگا۔ اسلامی نظام ہمیشہ اسی طریق پر قائم ہوا ہے اور آئندہ کبھی ہوگا تو اسی طرح ہوگا۔ جو لوگ اس کے سوا کسی دوسرے طریق کو قیام کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ سخت دھوکے میں ہیں۔" (روداد جماعت اسلامی ص۱۵۲-۱۵۳)

مندرجہ بالا بیان کو پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ اصلاحی صاحب ہمارے خیال کی مکمل تائید کر رہے ہیں یعنی یہ کہ اسلام ہمیشہ قلوب کے بدلنے

سے قائم ہوا کرتا ہے اور اصلاحی صاحب کے خیال کے مطابق وہ لوگ سخت دھوکے میں ہیں جو کسی اور ذریعہ کو اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اسلامی کے بانی و قائد مولانا مودودی صاحب نے اپنی کتاب "تجدید و احیائے دین" میں حضرت سید احمد صاحب شہید رح کی ناکامی کی جو وجوہات لکھی ہیں ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے یعنی حضرت شاہ صاحب نے ذہنی طور پر لوگوں کو نظام اسلامی کے قیام کے لئے تیار نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اس کتاب کے ص [illegible] پر فرماتے ہیں :-

"اس علاقہ میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کیلئے یہ ضروری تھا کہ خود اس علاقہ کی ہی آبادی میں اخلاقی و ذہنی انقلاب برپا کر دیا جاتا تاکہ مقامی لوگ اسلامی نظام حکومت کو سمجھنے اور اسکے انصار بننے کے قابل ہو جاتے۔ دونوں لیڈر غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ سرحد کے لوگ چونکہ مسلمان ہیں اسلئے وہ اسلامی حکومت کا خیر مقدم کریں گے ..... لیکن بالآخر تجربہ نے ثابت ہو گیا کہ نام کے مسلمانوں کو اصلی مسلمان سمجھنا اور ان سے وہ توقعات رکھنا جو اصلی مسلمانوں سے ہی پوری ہو سکتی ہیں محض ایک دھوکا تھا۔"

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک بھی نظام اسلامی برپا کرنے کیلئے دلوں اور ذہنوں کو بدلنا ضروری ہے تب کہیں جا کر نظام اسلامی قائم ہوگا لیکن یہ خیالات اس وقت کے ہیں جب جماعت کا دور آغاز تھا اور جماعت کے متفقین کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ چنانچہ اس وقت جماعت نے اپنا تمام زور اس بات پر صرف کیا کہ ہمارا مقصد اور طریق کار وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کا تھا یعنی لوگوں کے قلوب اور اذہان کو بدلنا اور انکو اسلامی بنانا اور جب یہ نظام لوگوں میں قائم ہو جائیگا تو خود بخود ملک میں بھی رائج ہو جائیگا۔ جماعت کے ان دعاوی کو دیکھ کر مایوس مسلمانوں کو امید کی ایک کرن نظر آئی اور وہ وافر تعداد میں جماعت کے گرد جمع ہونے لگے لیکن وہ یہ نہ جانتے تھے کہ مودودی صاحب اور انکی جماعت اسلامی کا مقصد اور عزم درحقیقت حکومت و اقتدار حاصل کرنا ہے۔

تقسیم برصغیر کے بعد جماعت اسلامی کو بھی پاکستان آنا پڑا لیکن چونکہ جماعت اپنے قابل اعتراض ماضی اور خلاف پاکستان سرگرمیوں کو اچھی طرح جانتی تھی اسلئے جماعت کے اراکین کچھ عرصہ تک منقار زیر پر رہے لیکن دبی زبان سے یہ تبلیغ بھی کرتے رہے کہ ہمیں حکومت سے دلچسپی نہیں۔ ہمیں تو لوگوں کو صحیح مسلمان بنانا اور نظام اسلام کو قائم کر دکھانا ہے۔ آہستہ آہستہ جماعت اپنے پروپیگنڈے کے بل پر ابھرنے لگی اور ملک کی سیاسی جماعتوں میں بھی اپنے لئے مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی اب جماعت اپنے پچھلے تمام دعاوی سے پھر گئی اور تجدید دین کا وہ طریق جو انبیاء کرام اور صلحاء عظام کا تھا ان کے نزدیک ناقابل عمل اور دقیانوسی حیثیت اختیار کر گیا۔ چنانچہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت اسلامی نے زور شور سے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ حکومت پر قبضہ کئے بغیر اصلاح خلق کی کوئی سکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مودودی صاحب اپنی کتاب "تنقیحات" کے ص۲۰ پر فرماتے ہیں :-

"پس یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کے سمجھنے کے لئے کچھ بہت زیادہ غور و فکر کی بھی ضرورت نہیں کہ اصلاح خلق کی کوئی بھی اسکیم حکومت کے اختیارات پر قبضہ کئے بغیر نہیں چل سکتی۔ اور جو کوئی حقیقت میں خدا کی زمین سے فتنہ و فساد کو مٹانا چاہتا ہو اور واقعی یہ چاہتا ہو کہ خلق خدا کی اصلاح ہو تو اس کیلئے محض واعظ اور ناصح بن کر کام کرنا فضول ہے۔ اسے اٹھنا چاہیئے اور غلط اصولوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے غلط کار لوگوں کے ہاتھ سے اقتدار چھین کر صحیح اصول اور صحیح طریقے کی حکومت قائم کرنی چاہیئے۔"

اس سے قبل آپ نے مودودی صاحب اور اصلاحی صاحب کے وہ بیانات پڑھے ہیں جن میں ہر دو حضرات نے اس بات پر زور دیا ہے کہ نظام اسلامی کے قیام کا واحد طریق دلوں کی دنیا کو بدلنا ہے اب مذکورۃ الصدر حوالہ کو پڑھئے ان کے بیانات میں کتنا واضح تضاد ہے۔ آگے چل کر مودودی صاحب اسی کتاب کے ص۲۰ پر فرماتے ہیں :-

"حکومت کے غلط اصولوں کو صحیح اصولوں سے بدلنے کی

کوشش کرو، ناخدا ترس اور فسق پسند قسم کے لوگوں سے قانون سازی اور فرمانروائی کا اقتدار چھین لو۔"

پھر آگے چل کر "تفہیمات" کے صفحہ پر اپنی جماعت اسلامی کے متعلق فرماتے ہیں:-

"یہ مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین (Preachers) اور مبشرین (Missionaries) کی جماعت نہیں بلکہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا سے ظلم، فتنہ، فساد، بداخلاقی، طغیان اور ناجائز انتفاع کو بزور مٹا دے اور ارباب من دون اللہ کی خداوندی ختم کر کے بدی کی جگہ نیکی قائم کرے۔"

پھر فرماتے ہیں:-

"لہٰذا اس پارٹی کے لئے (یعنی جماعت اسلامی کیلئے ناقل) حکومت کے اقتدار پر قبضہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔"

غرض ان حوالجات سے قارئین نے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اب جبکہ جماعت اسلامی کو یہ یقین ہو گیا کہ عوام کی ایک اچھی خاصی تعداد ان کے ساتھ مل گئی ہے تو وہ اپنے سابقہ بیانات کو بھول گئے اور انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حکومت اور اقتدار کی گدی پر قبضہ کئے بغیر تجدید دین اور اصلاح خلق کی کوئی سکیم نہیں چلائی جا سکتی۔

یہاں جماعت اسلامی کے اکابرین یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ ہم نے لوگوں کے دلوں اور ذہنوں کو بدل دیا ہے اور انہیں اسلامی بنا دیا ہے اسلئے اب حکومت پر قبضہ کرنا ضروری ہے تاکہ اسلامی قدروں کے مطابق نظام حکومت چلایا جا سکے لیکن یہ بھی سراسر غلط ہے کیونکہ جماعت کے اپنے اکابرین نے اس بات کی بارہا گواہی دی ہے کہ انہوں نے عوام کی کوئی اصلاح نہیں کی اور ابھی تک عوام کے دل اسلام کی روح کو سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہیں۔ چنانچہ مولانا مودودی صاحب خود فرماتے ہیں:-

"قوم کو اسلام کے نام سے محبت تو ہے لیکن اسلام سے ناواقفیت اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق نہیں کر سکتے۔" (تقریر مولانا مودودی صاحب مطبوعہ کوثر یکم اپریل ۱۹۴۷ء)

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے مودودی صاحب نے حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کی ناکامی کی وجوہات میں یہ وجہ بھی لکھی ہے کہ انہوں نے سرحد کے لوگوں میں اخلاقی اور ذہنی انقلاب برپا کئے بغیر نظام اسلامی کے قیام کا اعلان کر دیا تھا اسلئے وہ ناکام ہوئے۔ اب وہ خود اس اصل کو بھول رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اب مودودی صاحب اسی غلطی کو نہیں دہرا رہے۔ وہ بھی تو پاکستان کے مسلمانوں میں ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کئے بغیر حکومت پر قابض ہو کر نظام اسلامی کے قیام کے درپے ہیں۔

اصل حقیقت بہرحال یہی ہے کہ جماعت اسلامی اقتدار و حکومت کی بھوکی ہے اور ان کو اس کے حصول کے لئے خواہ کوئی غلط یا صحیح طریق بھی استعمال کرنا پڑے اور خواہ کتنا بھی غلط بیانی سے کام لینا پڑے جماعت اس سے گریز نہیں کرے گی۔

آخر میں عرض صرف اتنی ہے کہ ہمارے عوام کو ان باتوں پر اور جماعت اسلامی کے متضاد بیانات پر غور کرنا چاہیئے۔ جماعت اسلامی کا ماضی آپ کے سامنے ہے اس کا حال اس کے ماضی سے بھی بدتر ہے۔ اس کا مقصد محض حکومت و اقتدار کا حصول ہے جس کی خاطر وہ عوام کو مذہب کے نام پر اکٹھا کر کے اور "اسلام خطرہ میں ہے" کا نعرہ لگا کر اپنے لئے راستہ ہموار کرنا چاہتی ہے۔ لہٰذا آپ کو خبردار رہنا چاہیئے اور اس قسم کی جماعتوں سے جو اقتدار کی بھوکی ہیں اپنا دامن بچانا چاہیئے۔

ضروری اعلان

پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ضرور دیجئے ورنہ رسالہ کے نہ پہنچنے کی ذمہ داری آپ پر ہے ——— (مینیجر)

آپ کے اپنے مکتبہ کی کتابیں اور ٹریکٹ

احباب کرام! آپ ہمارے مکتبہ الفرقان سے ہر قسم کی مذہبی کتب طلب فرما سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل مفید کتابیں اور ٹریکٹ آپ کی مذہبی معلومات میں خاص اضافہ کرنے کا موجب ہونگی اور آپ اسلام اور احمدیت کے متعلق صحیح معلومات حاصل کر سکیں گے۔

(۱) **تفسیر کبیر** از حضرت امام جماعت احمدیہ جس میں قرآنی حقائق و معارف کا ایک دریا موجزن ہے۔ سورۂ یونس سے کہف تک کی تفسیر کا صرف ایک نسخہ ہمارے پاس ہے۔ قیمت پچاس روپے۔

(۲) **تفسیر سورۂ مریم**۔ یہ حضرت امام جماعت احمدیہ کے ان درس القرآن کے نوٹ ہیں جو آپ نے [illegible] میں مسجد مبارک ربوہ میں دیا۔ قیمت چودہ آنے۔

(۳) **تفہیمات ربانیہ**۔ اس کتاب میں غیر احمدی صاحبان کے ان تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو وہ سلسلہ احمدیہ پر کرتے ہیں یہ بھی نایاب ہے۔ صرف ایک نسخہ موجود ہے۔ قیمت دس روپے۔

(۴) **کلمۃ الیقین فی تفسیر خاتم النبیین**۔ خاتم النبیین کی تفسیر میں ایک جامع مگر نہایت مختصر مضمون ہے۔ یہ سولہ صفحات کا ٹریکٹ ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ ایک نسخہ کیلئے دو آنے کا ٹکٹ بھجوائیے تقسیم کرنے کیلئے فی سینکڑہ ۸/- روپے مقرر ہیں۔

(۵) **نیا انکشاف**۔ حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کی زندگی کے متعلق برٹش انسائیکلوپیڈیا میں شائع شدہ تصاویر سے ایک نیا انکشاف پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون انگریزی، عربی اور اردو میں اکٹھا ایک ہی ٹریکٹ میں شائع کیا گیا ہے۔ ایک نسخہ کے لئے دو آنے کے ٹکٹ اور فی سینکڑہ ۸/- روپے مقرر ہیں۔

(۶) **الفرقان** کے تمام خاص نمبر اپنے اندر جامعیت رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے ختم نبوت کے متعلق ایک خاص نمبر نکل چکا ہے۔ خلافت راشدہ کے بارہ میں ایک فیصلہ کن خاص نمبر شائع ہو چکا ہے۔ قرآنی حقائق و معارف پر ایک خاص نمبر نکل چکا ہے نیز ایک سالانہ نمبر پوری آب و تاب سے چھپ چکا ہے۔ ان چاروں خاص نمبروں میں سے ہر ایک کی قیمت ایک روپیہ مقرر ہے۔ چاروں نمبر ایک ساتھ طلب کرنے کی صورت میں صرف تین روپے لئے جائیں گے علاوہ محصول ڈاک۔

(۷) **عربی قصیدہ**۔ حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ علیہ السلام کو اپنے سید و مولا حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے جو والہانہ عشق تھا اس سلسلہ میں آپ کا ایک عربی قصیدہ مع ترجمہ و اعراب مکتبہ الفرقان نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی نسخہ دو آنہ۔

(۸) حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی کی جملہ تصنیفات مکتبہ الفرقان کی معرفت طلب فرمائیں۔ مندرجہ ذیل کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:- (۱) احکام القرآن ۳/۸/- (۲) امثال القرآن ۲/۸/- (۳) رحمۃ للعالمین حصہ اول ۳/۴/- دوم ۲/- (۴) نادر و نایاب تحریریں [illegible]

(۹) **مناظرہ مہت پور**۔ جماعت احمدیہ اور شیعہ صاحبان میں چار مسئلوں پر سیر حاصل تحریری مباحثہ ہو چکا ہے۔ جو فریقین کے مشترکہ خرچ پر شائع کیا گیا تھا۔ اس کے صرف چند نسخے باقی ہیں۔ فی نسخہ ۲/- روپے قیمت مقرر ہے۔

نوٹ:- مکتبہ الفرقان سے لٹریچر خرید کر آپ علمی اضافہ کے علاوہ اشاعت کے ثواب میں بھی حصہ لیں گے۔

منیجر مکتبہ الفرقان، ربوہ۔ ضلع جھنگ

(مولوی ابو العطاء طابع و ناشر نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ میں چھپوا کر دفتر "الفرقان" ربوہ سے شائع کیا)

حضرت امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ بنصرہ
کراچی سے دمشق کے لئے طیارہ پر سوار
ہو رہے ہیں۔

حضرت امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ بنصرہ کراچی
کے ہوائی مستقر پر جناب چوہدری محمد
ظفراللہ خاں صاحب سے گفتگو
فرما رہے ہیں۔

حضرت مولوی نذیر احمد علی صاحب رئیس التبلیغ
افریقہ جو ۱۹ مئی ۵۵ء کو سیرالیون میں فریضہ
تبلیغ اسلام ادا کرتے ہوئے انتقال فرما گئے
انا للہ و انا الیہ راجعون۔